ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly Hyderabad

SADA E SHIBLI

اپریل 2023 Apr جلد: 6: Vol شمارہ: Issue:62

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابو ہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/-امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی۔ پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مفتی محمد فاروق قاسمی۔ مولانا ارشاد الحق مدنی
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق۔ ڈاکٹر حمران احمد۔ ڈاکٹر ناظم علی
ڈاکٹر مختار احمد فردین۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری۔ ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
ڈاکٹر سمیہ تمکین۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ڈاکٹر آصف لئیق ندوی۔ ڈاکٹر مظفر علی ساجد۔
مولانا عبدالوحید ندوی۔ مولانا احمد نور عینی
ابو ہریرہ ایوبی۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	اختلاف امت اور ان کا حل	حضرت مولانا مفتی شفیع	۷
۴	دین فطرت کی پہچان	مولوی حبیب الرحمٰن	۸
۵	علامہ شبلی کی ایک اور تقریر (شمس العلماء کا خطاب ملنے پر)	ڈاکٹر الیاس الاعظمی	۱۱
۶	قمر جالی کے تنقید وتبصرے: ایک جائزہ	صبیحہ سلطانہ	۱۵
۷	اردو رپورتاژ کے مجموعے (حیدرآباد کے حوالے سے)	نسرین صدیقہ	۱۸
۸	غزل	سردار سلیم	۲۲
۹	عصر حاضر میں صحافیوں کا کردار اور فضلاء مدارس کی ذمہ داریاں!	ڈاکٹر آصف لئیق ندوی	۲۳
۱۰	تری مسکراہٹ	ڈاکٹر رحیم رامش	۲۹
۱۱	چٹ نکاح پٹ ولیمہ۔ کیوں نہیں؟	ڈاکٹر علیم خان فلکی	۳۰
۱۲	(ہندو سماج کی ذات پات اور غیر ہندو سماج کی ذات پات میں فرق)	احمد نور عینی	۳۳
۱۳	غزل	رہبر پرتاب گڑھی	۳۶
۱۴	غزل	نورالدین نور غوری	۳۶
۱۵	''حرف واثر'' اور بیان شبلی۔ ایک مطالعہ	مبصر: اسامہ ارشاد معروفی قاسمی	۳۷

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب ابوسفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی

جناب محمد یوسف بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی محمد فاروق قاسمی، صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

ڈاکٹر سید جلیل حسین ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

مولانا منصور احمد قاسمی، معین آباد، تلنگانہ

الحاج رئیس احمد اقبال، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج محمد زکریا انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ)

ڈاکٹر شہباز احمد، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا محمد عبدالقادر سعود، نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج محمد قمرالدین، نیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج محمد عبدالکریم، صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

ماہ اپریل ۲۰۲۳ء میں عید الفطر ہے، ہماری شریعت میں اس دن خوشی منانا عبادت کے درجے میں ہے۔ اچھی غذا، لباس، خوشبو، مبارک بادی وغیرہ کے ذریعہ خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں عید الفطر کی خوشی اسی شخص کو حاصل ہے، جس نے رمضان المبارک کی قدر کی ہو، رحمت، مغفرت، نجات عن النار والے عشروں سے غافل نہ رہا ہو، روزے کو عبادات، اخلاق، صدقات، خیرات اور تلاوت ربانی سے مضبوط کیا ہو، اور اس نے اپنی قوت نفسانیہ، شہوانیہ، شیطانیہ پر قابو رکھا ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور دست بستہ دعا کی جاتی ہے کہ اللہ رب العزت ہم سب کو حقیقی عید الفطر کی خوشی نصیب کرے آمین۔

ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد تمام لوگوں کو بالخصوص اپنے معاونین، محبین، متعلقین کو عید الفطر کی مبارک باد پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ رب العزت اس پر مسرت عید کے ذریعہ عالم اور ملک میں امن و عافیت عطا کرے آمین۔

معروف عالم دین آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے چوتھے صدر، ندوۃ العلماء کے ناظم، دار العلوم دیوبند کے رکن مجلس شوری، عالمی رابطہ ادب اسلامی ریاض سعودی عرب کے نائب صدر، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکنِ اساسی، دار المصنفین اعظم گڑھ کے رکن، عربی اور اردو زبان میں تقریباً ۳۰ کتابوں کے مصنف مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۹۳ سال کی عمر میں ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء، ۲۱ رمضان المبارک کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ مولانا کی زندگی اسلاف کا نمونہ تھی، مولانا نے اپنی حیات میں دینی، ملی، مذہبی، عالمی، داخلی، خارجی ہر کام کو بڑے حوصلے کے ساتھ شفقت و محبت، عجز و انکساری، اتحاد و اتفاق اور تحمل و بردباری سے انجام دیا۔ مولانا اس صدی کے ایسے عالم تھے کہ ان پر پوری دنیا میں بلا لحاظ مذہب و مسلک و مشرب کے اتفاق رہتا تھا اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اللہ رب العزت مولانا کی مغفرت، جنت الفردوس اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور اس امت کو اُن کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔ ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی حیات طیبہ پر سلام پیش کرتا ہے اور ان کی عملی، دینی، ملی، سماجی اور تحقیقی خدمات پر خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

پورے ملک میں ہر شخص کی زبان پر یہی ہے کہ یوپی کے پریاگ راج الہ آباد میں تین بدمعاشوں نے سابق رکن پارلیمنٹ عتیق احمد سابق رکن اسمبلی اشرف احمد کو ہتھکڑی اور پولیس کے گھیرے میں رہتے ہوئے گولیوں سے بھون دیا، لوگ سکتے میں ہیں کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، کیا ہمارے ملک اور یوپی کی پولیس اتنی کمزور ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ پریاگ راج میں انسان کے قتل کے ساتھ ہندوستان کے قانون کا قتل ہوا ہے، سوشل میڈیا کے ذریعے جو ویڈیو وائرل ہو رہی ہے اس سے بے شمار سوالات اُبھرتے ہیں، ان سوالات کے جوابات کس طرح ملیں گے آنے والا وقت بتائے گا۔ بدمعاشوں نے سیلنڈر کرتے ہوئے جے شری رام کے نعرے لگائے اور اقبال جرم کرتے ہوئے یہ کہا کہ ہمیں بڑا مافیا بننا ہے، کیا ہمارے ملک کا نوجوان ایسا سوچ رہا ہے، ہمارے ملک کی سیاست اپنی رعایا کو کہاں پر لے کر جا رہی ہے، ترقی کی بات ہوتی ہے، مگر نفرت کے ماحول میں ترقی کیسے ممکن ہے، عدالت کی بات ہوتی ہے، مگر عدالت کے حکم کی توہین کر کے کیسے نظام عدل قائم کیا جاسکتا ہے اتنی بات تو طے ہے کہ ظلم، ظلم ہوتا ہے، بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے، آج ہمارے ملک کی عوام کو تشدد اور تعصب کی عینک کو اتار کر ملک کو دستور پر کیسے عمل ہو اس کے لئے کام کرنے کی ضرورت ہے، اور آواز اٹھانے کی ضرورت ہے، کیونکہ بقول شاعر:

کچھ نہ کہنے سے بھی چھن جاتا ہے اعجاز سخن ☆ ظلم سہنے سے بھی ظالم کی مدد ہوتی ہے

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

ابوسفیان اسلام سے پہلے جیسے کچھ تھے، غزوات نبوی کا ایک ایک حرف اس کا شاہد ہے، بدر سے لے کر فتح مکہ تک جتنی لڑائیاں اسلام کو لڑنی پڑیں ان اکثر میں ان کا ہاتھ تھا لیکن فتح مکہ کے موقع پر جب وہ گرفتار کر کے لائے گئے اور حضرت عباسؓ ان کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، تو آپ ﷺ ان کے ساتھ محبت سے پیش آئے، حضرت عمر نے گذشتہ جرائم کی پاداش میں ان کے قتل کا ارادہ کیا لیکن آپ ﷺ نے منع فرمایا اور نہ صرف یہ بلکہ ان کے گھر کو امن وامان کا حرم بنادیا، فرمایا کہ "جو سفیان کے گھر میں داخل ہوجائے اس کا قصور معاف ہوگا۔" کیا دنیا کے کسی فاتح نے اپنے دشمن کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے؟

عرب کا ایک ایک قبیلہ اطاعت کیشانہ اسلام کے پرچم کے نیچے جمع ہو رہا تھا، اگر کسی قبیلہ نے آخر تک سرتابی کی تو وہ بنوحنیفہ کا قبیلہ تھا، جس میں مسیلمہ نے ادعائے نبوت کیا تھا، ثمامہ بن اثال اس قبیلہ کے رؤسا میں تھا، اتفاق سے وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگ گیا، گرفتار کر کے مدینہ لے آئے، آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ اس کو مسجد کے ستون میں باندھ دیا جائے، اس کے بعد آپ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور اس سے دریافت کیا کہ کیا کہتے ہو، اس نے کہا "اے محمد ﷺ! اگر تم مجھے قتل کرو گے تو ایک خونی کو کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو تم مانگو میں دونگا" یہ جواب سن کر آپ ﷺ خاموش رہے، دوسرے دن بھی یہی تقریر ہوئی، تیسرے دن بھی جب اس نے یہی جواب دیا تو آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ثمامہ کی رسی کھول دو اور آزاد کردو، ثمامہ پر اس خلاف توقع لطف وعنایت کا یہ اثر ہوا کہ قریب ایک درخت کی آڑ میں جا کر غسل کیا اور مسجد میں واپس آ کر کلمہ پڑھا اور مسلمان ہوگیا اور عرض کی "یا رسول اللہ ﷺ! دنیا میں کوئی شخص میری نظر میں آپ ﷺ سے زیادہ مبغوض نہ تھا اور اب اس سے زیادہ دنیا میں مجھے کوئی محبوب نہیں، کوئی مذہب آپ ﷺ کے مذہب سے زیادہ میری آنکھوں میں برا نہ تھا اور اب وہی سب سے زیادہ پیارا ہے، کوئی شہر آپ ﷺ کے شہر سے زیادہ ناپسند نہ تھا اور اب وہی پسندیدہ ہے۔"

قریش کی ستم گری و جفاگری کی داستان دہرانے کی ضرورت نہیں، یاد ہوگا کہ شعب ابی طالب میں تین برس تک ان ظالموں نے آپ ﷺ کو اور آپ ﷺ کے خاندان کو اس طرح محصور کر رکھا تھا کہ غلہ کا ایک دانہ بھی اندر نہیں پہنچ سکتا تھا، بچے بھوک سے روتے اور تڑپتے تھے اور یہ بے دردان کی آوازیں سنتے اور ہنستے اور خوش ہوتے تھے لیکن معلوم ہے کہ رحمت عالم ﷺ نے اس کے معاوضہ میں قریش کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ مکہ میں غلہ یمامہ سے آتا تھا، یمامہ کے رئیس یہی ثمامہ بن اثال تھے، مسلمان ہوکر جب یہ مکہ گئے تو قریش نے تبدیل مذہب پر ان کو طعنہ دیا، انہوں نے غصہ سے کہا کہ "خدا کی قسم اب رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے بغیر گیہوں کا ایک دانہ بھی نہیں ملے گا" اس بندش سے مکہ میں اناج کا کال پڑ گیا، آخر میں گھبرا کر قریش نے اس آستانہ کی طرف رجوع کیا جس سے کوئی سائل کبھی محروم نہیں گیا، حضور ﷺ کو رحم آیا اور کہلا بھیجا کہ بندش اٹھالو، چنانچہ پھر حسب دستور غلہ جانے لگا)۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۲۸۸-۲۸۹)

اختلاف امت اوران کا حل

شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب قدس سرہ مالٹا کی چار سالہ جیل سے رہائی کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تو علماء کے ایک مجمع کے سامنے آپ نے ایک اہم بات ارشاد فرمائی۔

جو لوگ حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں وہ اس سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ ان کی یہ قید و بند عام سیاسی لیڈروں کی قید نہ تھی۔ جنگ آزادی میں اس درویش کی ساری تحریکات صرف رضائے حق سبحانہ وتعالی کے لئے امت کی صلاح وفلاح کے گرد گھومتی تھیں مسافرت اور انتہائی بے کسی کے عالم میں گرفتاری کے وقت جملہ جوان کی زبان مبارک پر آیا تھا، ان کے عزم اور مقاصد کا پتہ دیتا ہے، فرمایا:

الحمدللہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمصیبتے

جیل کی تنہائی میں ایک روز بہت مغموم دیکھ کر بعض رفقاء نے کچھ تسلی کے الفاظ کہنا چاہے تو فرمایا اس تکلیف کا کیا غم ہے جو ایک دن ختم ہوجانے والی ہے غم اس کا ہے کہ یہ تکلیف ومحنت اللہ تعالی کے نزدیک قبول ہے یا نہیں۔

مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اس وقت فرمایا کہ ہم نے مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں۔ فرمایا کہ میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں، بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

☆☆☆

مولوی حبیب الرحمن۔حیدرآباد

دین فطرت کی پہچان

آج کل کے مذہبی پیشواؤں ورہنماؤں کی یہ غلط تحریک کہ تمام مختلف مذاہب حق ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت و برتری نہیں۔ محض اس وجہ سے پھیلتی جارہی ہے کیونکہ کہنے والے اور سننے والے انسان کی فطرت سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ افسوس کہ ان ناواقفوں میں مسلمان بھی ہیں۔ انسان کی یہ ناواقفیت اس کی عارضی و ابدی تباہی کا سبب تو بن سکتی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ انسانیت ایک ہی ہے، تمام انسانوں کے فطری جذبات وخواہشات ایک ہی ہیں اور سب انسان ایک ہی اللہ کے بندے ہیں۔ اس لئے سب انسانوں کا ایک ہی دین ہونا عقل وفطرت کا تقاضہ ہے۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ہر ذرّہ اللہ تعالیٰ کا مطیع و منقاد ہے اور اسی اطاعت وانقیاد کی وجہ سے تمام کائنات کے نظم میں یکسانیت پائی جاتی ہے، جس میں کوئی خلل نہیں ہے۔ نظامِ کائنات کی اس یکسانیت سے انسان کی بقاء و صحتِ جسمانی میں اعتدال وتوازن قائم ہے اور اس کی وہ تمام خواہشات، بقاءِ حیات سے جن کا تعلق ہے پوری ہورہی ہیں۔ انسان کی ایک فطری خواہش یہ بھی ہے کہ اس کی زندگی میں اعتدال وتوازن قائم رہے یعنی فتنہ وفساد، ظلم (حق تلفی) و زیادتی سے محفوظ ہو اور اس کو ایک ابدی اعلیٰ ولازوال زندگی حاصل ہو یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ تمام انسانوں کا ایک ہی دین، دین الٰہی (اسلام) ہو۔

دینِ فطرت، فطرت انسانی کا آئینہ ہے اس وجہ سے مشکل نہیں سہل ہے اور سکون بخش بھی۔ اس کے قبول کرنے میں قلبِ انسانی کوئی تنگی اور گرانی محسوس نہیں کرتا نہ اس کے احکام وہدایات انسانی غیرت وخودداری کے خلاف ہیں اور نہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی غلامی اختیار کرنے پر اور نہ دوسرے انسان کا فقیر ومحتاج بن کر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دینِ فطرت میں انسان کو اس کی فطری خواہشات کی نشان دہی کی گئی ہے اور صحیح طریقہ سے تمام خواہشات کو پورا کرنے کی تعلیم ہے۔ یہی دینِ فطرت، دینِ اسلام، دینِ الٰہی کی پہچان ہے۔

انسان میں اُنس ومحبت کا جذبہ بھی ہے اور بغض و عداوت کا بھی، اطاعت وانقیاد کا جذبہ بھی ہے اور حکومت و فرماں روائی کا بھی، اس میں غم وغصّہ بھی ہے اور رحم وکرم بھی، حرص بھی ہے اور قناعت بھی دینِ فطرت میں ان سب جذبات کی تربیت ہے تاکہ جذبات کے استعمال کا محل صحیح ہوجائے۔ جس دین میں فنائے جذبات کی تعلیم ہو وہ دینِ فطرت نہیں ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ انسان اس دنیا میں ایک بے خوف وحزن، امن وسلامتی کی زندگی چاہتا ہے

لیکن بہت کم لوگ انسان کی اس چھپی ہوئی خواہش سے واقف ہیں کہ وہ ایک ابدی غیر فانی پُر مسرت زندگی بھی چاہتا ہے اوراس سے بھی ناواقف ہیں کہ انسان میں اپنے خالق ورب سے ملنے اوراس کو دیکھنے کی خواہش بھی ہے۔

دینِ فطرت میں انسان کوان پوشیدہ فطری خواہشات سے بھی باخبر کیا گیا ہے۔ دینِ فطرت کو قبول کرنے کے بعد جب انسان کے فطری جذبات کی تربیت ہوجاتی ہے تو انسان کی زندگی میں اعتدال وتوازن قائم ہوجاتا ہے اور انسان صالح و نیک بنتا جاتا ہے۔ انسان کی یہی صالحیت انسان کے مذکورہ باطنی فطری خواہشات (یعنی ایک ابدی غیرفانی پُرمسرت زندگی اور دیدہ ولقائے رب) کی تکمیل کا الٰہی ذریعہ ہے جس کے ضمن میں اس دنیاوی زندگی میں بھی امن وسلامتی نصیب ہوتی ہے اور اس زندگی کے کاروبار عدل واحسان کی بنیادوں پرانجام پاتے ہیں اوراس کا جذبۂ حکمرانی نفس کی شرارتوں سے محفوظ ہوجاتا ہے جس کے بعد فتنہ وفساد کا کوئی شائبہ باقی نہیں رہتا۔

دین فطرت میں اس خیال کی گنجائش ہی نہیں کہ دنیا علیحدہ ہے اور دین علیحدہ۔ کیونکہ کھانے' پینے' رہنے' سہنے کی خواہشات' جنسی میلانات اور زندگی کے تمام کاروبار' تجارت' زراعت' معاشرت' سیاست وغیرہ کواحکام وہدایات رب کے تحت انجام دینا ہی ''دین اسلام'' ہے اوراس طرح احکام و ہدایاتِ ربّانی کے مطابق زندگی بسر کرنا ہی اللہ کی عبادت کرنا ہے یعنی اپنی فطری حیثیت' بندگی رب پر قائم ہوجانا ہے تاکہ فلاحِ دارین حاصل ہو گویا عبادت' راعی اور رعیت کے تعلق کی طرح بندہ اوراللہ کا ایک دستوری تعلق نہیں ہے بلکہ فطری وحبّی تعلق ہے جس کے قائم ہوجانے کے بعد انسان کی زندگی سرتاپا بندگیٔ رب کی تعریف میں داخل ہوجاتی ہے۔عبادت کے اس جامع وسیع مفہوم سے ناواقف ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ عبادت کو چند مخصوص اعمال کی حد تک محدود سمجھتے ہیں۔

نیز بندگی کے متعلق یہ سمجھنا کہ وہ بے بسی اور بے چارگی کا نام ہے لغو بات ہے۔ اللہ سے بندگی کا تعلق تو وہ بلند واعلیٰ نسبت ہے جوانسان کوتمام مخلوق کی غلامی سے آزاد کراکے اس کوایک بہادر و باہمّت انسان بنادیتی ہے اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ دین ایک ذمہ داری ہے جواللہ تعالیٰ نے بندوں پر عائد کی ہے، بلکہ دینِ حق' دینِ فطرت' دینِ اسلام' انسانی فطرت کا تقاضہ تھا جس کو اللہ جل شانہ نے اپنے فضل ورحمت سے پورا فرما کر انسان کی حاجت روائی فرمائی اوراس فضل ورحمت پر مسرور وشاداں رہنے کا حکم دیا۔

''قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ط'' (سورہ یونس:58)

ترجمہ: (آپ کہہ دیجئے کہ یہ اللہ کا فضل ورحمت ہے پس لوگوں کواس پر مسرور ہوجانا چاہئے۔)

دینِ فطرت میں انسان کوعقل ودانش سکھائی گئی ہے۔ انسان کواس کی اصلاح کے لئے علم وحکمت کی تعلیم دی گئی ہے جوعلم برائے عمل ہو، اصلاح عمل کے لئے ہو وہ محض کتابیں پڑھنے سے مفید نہیں ہوتا جب تک اس کو کسی ماہر سے حاصل نہ کیا جائے۔ اسی طرح دینِ فطرت کو سمجھ کر اس پر گامزن ہونے کے لئے بھی کسی دین کے ماہر کی صحبت میں رہ کر تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے اس کے بغیر قرآنی بصیرت کماحقہ پیدا نہیں ہوتی۔ دین کے ماہر وہی ہوتے ہیں جو قرب وصدیقیت کے مقام پر فائز کئے جاتے

ہیں۔(قرب وصدیقیت کی تشریح کتاب کے آخری حصہ میں ملاحظہ ہو)۔

اس انداز سے سوچنا اور سمجھنا کہ دینِ فطرت' دینِ اسلام میں زندگی کے پیچیدہ مسائل کا کیا حل ہے درپردہ اس نقص وخامی کا اظہار ہے کہ سوچنے والوں کے پیش نظر اسی دنیا کا نفع وضرر ہے جو لوگ اسی طرح سوچتے اور سمجھتے ہیں ان کا طریقۂ دعوت کماحقہٗ منہاجِ نبوۃ نہیں ہوتا۔ دنیا پرست لوگ' دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کے لئے جن اشتہاری طریقوں کو ایجاد واختیار کر کے اپنی تحریکات کو مقبولِ عام بنانے کی کوشش کرتے ہیں یہ لوگ بھی ویسی ہی روش اختیار کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی انقلاب بھی اسی طریقہ سے برپا کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اسی نوعیت کے اخبارات ورسائل کا اجراء' افسانہ نویسی' تمثیل نگاری' ادبی جلسے وغیرہ حالانکہ دینِ فطرت کو سمجھنے اور سمجھانے کا صحیح اندازِ فکر یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کیا حقیقی تصور اور انسان کا کیا حقیقی نفع وضرر' دینِ فطرت میں پیش کیا گیا ہے اور ضرر سے بچنے اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کے کیا فطری ذرائع بیان کئے گئے ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کا کیا طریقہ بتلایا گیا ہے جس کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص منزل مقصود کو نہیں پہنچ سکتا۔ اسی سلسلہ میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند ضروری باتیں عرض کردوں۔

لفظِ دین جو کتاب وسنت کا لفظ ہے اس کو بدل کر لفظِ تحریک استعمال کرنا اور اس عمل کو جائز قرار دینے کے لئے یہ دلیل پیش کرنا کہ ''دین کا لفظ اتنا پرانا ہوگیا ہے کہ تعلیم یافتہ افراد اس لفظ کو سن کر اسلام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے'' صحیح استدلال نہیں ہے، بگڑی ہوئی ذہنیتوں کی اتباع ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ سے کتاب و سنت کے الفاظ کے اصلی مفہوم پر جو پردے پڑ جاتے ہیں ان کو چاک کر کے ان الفاظ کا قرآنی مفہوم واضح کیا جائے نہ یہ کہ کتاب وسنت کے الفاظ ہی بدل دیئے جائیں۔ لفظِ دین میں اطاعت وفرمانبرداری اور ابدی جزائے اعمال اور یومِ قیامت کا جو قرآنی مفہوم ہے وہ کسی طرح لفظِ تحریک سے واضح نہیں ہوتا غالباً یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کی تقریر وتحریر میں اخروی زندگی کو نمایاں کر کے پیش نہیں کیا جاتا اور نہ ابدی نقصان سے ڈرایا جاتا ہے اور نہ اس انداز سے تعلیم وتربیت دی جاتی ہے۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ دینِ اسلام کو بگڑی ہوئی ذہنیتوں کے مطابق بنا کر پیش کرنا ''حکمت'' ہے حالانکہ انبیائی قرآنی طریقۂ دعوت یہ ہے کہ بگڑی ہوئی ذہنیتوں کو دینِ فطرت کے مطابق بنانے کی جدوجہد کی جائے۔

تبلیغی واصلاحی جدوجہد کرنے والوں کا طریقۂ کار مذکورۂ بالا لغزشوں سے بالکل پاک ہونا چاہئے جو لوگ تبلیغی واصلاحی کام کررہے ہیں دعا ہے کہ ان کی جدوجہد کے کسی پہلو میں کوئی خامی ونقص نہ رہے اور تعلیم وتربیت و دعوت بالکلیہ بطریقِ نبویؐ ہوجائے۔

یہ نکتہ بھی ذہن نشین رہنا چاہئے کہ ایک معلّم فطرت اور کامل نمونۂ بندگی کو سامنے رکھے بغیر طالبِ حق' دینِ فطرت کو اختیار کر کے نہ بندگیٔ رب کا شرف حاصل کر سکتا ہے نہ مدارجِ بندگی پر فائز ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔اعظم گڑھ

علامہ شبلی کی ایک اور تقریر

(شمس العلماء کا خطاب ملنے پر)

۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷ - ۱۹۱۴ء) کو شمس العلما کا خطاب ملا۔اس موقع پر ایم اے او کالج علی گڑھ میں ایک تہنیتی تقریب منعقد ہوئی، جس میں کالج کی متعدد سربرآوردہ شخصیات سرسید احمد خاں، سید محمود، نواب محسن الملک، نواب سر مزل اللہ خاں وغیرہ شریک ہوئے اور تہنیتی تقریریں ہوئیں اور اردو، عربی اور فارسی میں قصائد و منظومات پیش کی گئیں۔اس موقع پر علامہ شبلی نے بطور شکریہ جو تقریر کی تھی وہ تقریب کی روداد کے ساتھ ۶ر فروری ۱۸۹۴ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔شکریہ کی یہ تقریر ''خطبات شبلی'' مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی اور راقم کے مرتبہ ''خطبات شبلی: نو دریافت'' میں شامل نہیں ہے۔چونکہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ کی فائلیں علی العموم دستیاب نہیں ہیں اور یہ تقریر اپنے بعض مشمولات کے لحاظ سے مطالعہ شبلی میں بڑی اہمیت کی حامل ہے، اس لئے اس کی اشاعت ضروری معلوم ہوئی۔

اعضائے لجنۃ الادب(۱) وبرادران اخوان الصفا(۲)

آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطیہ خطاب (شمس العلما) کی تقریب میں مجھ کو ایوننگ پارٹی میں مدعو کیا ہے اور جس جوش اور خلوص سے آپ نے اس موقع پر مجھ کو اس خطاب پر مبارک باد دی ہے، میں نہایت سچے دل سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔حقیقت میں میرے لئے اس سے زیادہ فخر اور عزت کا کیا موقع ہوسکتا ہے کہ لجنۃ الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اس مقدس زبان میں ہم کو اسپیچ اور لکچر دیا جاسکتا ہے جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے، جس کے ممبروں میں مولوی بہادر علی صاحب ایم اے فرسٹ ڈیویژن، سید کلن صاحب ایم اے اور کیسے ایم اے ڈبل ایم اے۔

داؤد بھائی صاحب جیسے ادیب ،مزمل اللہ خاں صاحب رئیس، جناب حاجی اسماعیل خاں صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے گر اور اس کے آنریری ممبروں میں ہمارے مخدوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی داخل ہیں، میرے خطاب کی نسبت مبارک باد دینا ایک ایسا فخر اور ایسی عزت ہے جس سے زیادہ اور کیا ہوسکتی ہے۔

اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اس قدیم مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی ہے جو سنہ ۱۸۸۸ء میں قائم ہوئی تھی، جس کے سکریٹری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر مسٹر (ٹی ڈبلیو) آرنلڈ ہیں اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لایق فایق اشخاص ہیں، ایسی مجلس کا مجھ کو مبارک باد دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہے۔

اے حضرات!

اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر اور عزت کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قاعدے سیاست اور انتظام کے اعلیٰ اصول پر مبنی ہیں اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھ کو عطا کیا ہے، نہایت قدر و منزلت کرتا ہوں، لیکن میں آپ کو کافی یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کی جو قوم کی طرف سے دیا جاتا ہے گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں کرتا اور یہ میری کچھ بے جا بات نہیں بلکہ اس زمانہ میں بھی جبکہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی ،مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطاب کی بہ نسبت قومی خطاب کی عزت زیادہ نہیں کی۔ اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کئے ہوئے خطابات بالکل معدوم ہوگئے اور قوم کے عطا کئے ہوئے خطابات یعنی حجۃ الاسلام: امام غزالی کے لئے۔امام : فخر الدین رازی کے لئے۔علم الہدی: شریف مرتضیٰ کے لئے آج بھی باقی اور قائم ہیں۔ پس جب میں یہ کہتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب کے عطا کرنے کی عزت مجھ کو دی ہے ، اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قایم مقام ہیں، پسند کرتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر میرے لئے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۶ رجنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھ کو یہ خطاب ملا تھا تو آج ۱۹ رجنوری کو مجھ کو قوم کے دربار سے یہ خطاب ملا ہے۔

ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

اے حضرات!

جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرا فرض ہے کہ نہایت سچے دل سے گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں جو اس نے اس خطاب کے دئے جانے کی نسبت اختیار کی ہے۔

حضرات!

آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی حکومت کے تمام آثارات کو، علوم کو، فنون کو، تہذیب کو، تمدن کو، مٹا دینا چاہتی ہے۔**قال اللہ تعالی جعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذالک یفعلون.** لیکن انگریزی گورنمنٹ نے بخلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت اور نہ صرف

اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ قدیم عمارتوں کی نسبت جو کچھ اہتمام گورنمنٹ کو ہے وہ مخفی نہیں۔ اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی تعلیم کی۔

حضرات!

اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنی چاہتا ہے، کسی قسم کے خطاب کی خواہش قومی یا خطابات کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا، ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہے۔ اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ اس قسم کے اعزاز سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کی ہمت بندھتی ہے۔ ہم کو گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اس بات کا موقع حاصل ہے کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھیں۔ اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لئے قدردانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا اور آرزو ہے تو گورنمنٹ ہماری قدردانی اور ہماری عزت افزائی کے لئے اسی طرح موجود ہے جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت۔ مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مفتی میر عباس صاحب مرحوم، مولوی حامد حسین صاحب مرحوم، اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں موجود ہوتے تو ان کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہو سکتی تھی جو انگریزی گورنمنٹ نے ان کو عنایت کیا۔

حضرات جبکہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کر رہا ہوں تو نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے، یعنی ہمارا یہ قومی کالج (علی گڑھ)۔

حضرات میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اگر وہ کوئی پرسنل اور ذاتی معاملہ ہے تو آپ مہربانی سے ذاتی معاملہ کی نسبت بھی مجھ کو اجازت دیجئے کہ اس کو اس عام مجمع میں علانیہ ظاہر کروں، یعنی کالج کے احسانات جو خاص مجھ پر ہیں۔

حضرات یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ علمی یا تعلیمی زندگی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز، اس کی نشوونما، اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا ہے اسی کالج سے ہوا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہاں آنے پہلے میں نے تصنیف کے دائرہ میں قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ سچ ہے کہ آج سے بہت پہلے میری دو تین کتابیں چھپ چکی تھیں اور وہ شائع ہو چکی تھیں، لیکن ان کا کیا مقصد تھا؟ آپس کے مذہبی جھگڑے، مسلمانوں کی جماعت کو منتشر کرنا اور جو انتشار پہلے سے موجود تھا، اس کو اور قوت و استحکام دینا۔ میں آج سے بہت پہلے فارسی میں شعر بھی کہتا تھا، لیکن وہ کس قسم کے اور کس درجہ کے تھے۔ آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ میں اپنی موجودہ شاعری کو اعلیٰ رتبہ کی خیال کرتا ہوں بلکہ یہ مطلب ہے کہ آج کی میری شاعری اگر پست ہے تو اس وقت پست تر تھی اور اب اگر خراب ہے تو جب خراب تر تھی۔ غرض یہ کہ میں نے جو کچھ سیکھا ہے اور جو کچھ ترقی کی ہے وہ اسی کالج کی بدولت کی ہے۔ اس لحاظ سے میں جس طرح اس کالج

کا پروفیسر ہوں اسی طرح اس کا ایک تربیت یافتہ شاگرد بھی ہوں۔

اے ممبران اخوان الصفا ولجنۃ الادب

آپ یہ نہ خیال فرمائیں کہ یہ کالج صرف طالب علموں اور اسٹوڈنٹس کو علمی ترقی دلاتا ہے بلکہ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کی علمی اور روحانی ترقی کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اگر وہ طالب علموں کو بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں دیتا ہے۔ وہ پروفیسروں اور ماسٹروں کو شمس العلما کر سکتا ہے۔

صاحبو!

یہ محض ظاہر بینی ہے بلکہ صریح غلط فہمی ہے کہ آپ اس کالج کے فوائد کو یونیورسٹی کے کورس تک محدود سمجھیں، علاوہ ان بہت سے فوائد کے جو یہاں کی مختلف سوسائٹیوں مثلاً یونین کلب، الفرض، اخوان الصفا، لجنۃ الادب وغیرہ سے حاصل ہوتے ہیں اور جو اسی کالج کے ساتھ مخصوص ہیں، ایک خاص بات اور سب سے بڑی بات جو اس کالج میں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ یہاں ایسے اہل کمال جمع ہیں جن کی بدولت یہ کالج بہت سے ایسے مضامین کا درس گاہ کہا جا سکتا ہے جس کا نام ونشان بھی دوسرے کالجوں میں نہیں مل سکتا۔ ہمارے کالج کے احاطہ میں سید محمود، مولانا حالی، نواب محسن الملک جمع ہیں۔ اور اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے کالج میں فن قانون کا ایسا پروفیسر موجود ہے جس کے نظیر سے تمام ہندوستان کے قانونی کالج خالی ہیں۔ ہمارے کالج میں شاعری اور فن شعر کا وہ پروفیسر موجود ہے جو شاعری کا رفارمر اور خاتمۃ الشعرا ہے۔ ہمارے کالج میں پالیٹکس اور انتظام کا وہ بڑا پروفیسر ہے جس نے حیدرآباد کی عظیم الشان ریاست کو انگریزی طرز انتظام کے قالب میں ڈھالا ہے۔ کیا کسی کالج، کسی یونیورسٹی میں قانون، شاعری، پالیٹکس کے ایسے بے نظیر پروفیسر کوئی شخص دکھا سکتا ہے۔

حضرات!

میں نے بزرگوں کی جو فہرست پیش کی ہے، اس میں ایک نام اور سب سے بڑا نام دانستہ بھولا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک جب اس کالج کا یا کالج کے متعلق جس چیز یا جس شخص کا نام لیا جائے اس میں اسی بڑے شخص (سرسید احمد خاں) کا جلوہ موجود ہوتا ہے۔ ع

جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔

[علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، ۶ر فروری ۱۸۹۴ء]

تعلیقات وحواشی

(۱) لجنۃ الادب کی بنیاد علامہ شبلی نے بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''کالج میں عربی زبان کی ترقی اور طلبہ میں عربی تحریر وتقریر کا شوق دلانے کے لئے ڈالی۔ اس لجنۃ الادب میں طلبہ بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے اور عربی کے طالب العلم عربی میں تحریریں پڑھتے تھے، نظمیں سناتے تھے اور تقریریں کرتے تھے۔

(حیات شبلی، ص ۲۰۵)

(۲) اخوان الصفا: ایم اے او کالج علی گڑھ کی یہ انجمن اردو طلبہ کے لئے قائم کی گئی تھی، اس میں طلبہ اردو میں مضامین پڑھتے اور تقریریں کرتے تھے۔ (ایضاً) انہی دونوں انجمنوں کی طرف سے تہنیت کی یہ تقریب منعقد کی گئی تھی۔

صبحیہ سلطانہ۔ ریسرچ اسکالر فیکلٹی آف اورینٹل لینگویج، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

قمر جالی کے تنقید و تبصرے: ایک جائزہ

تنقید اور تبصرے دونوں کی ہیئت مضمون کی طرح ہوتی ہے۔ ''مضمون'' خیالات و نظریات کے تبادلے کی ایک بہترین اور مقبول صنف ہے۔ اس کے ذریعے ذہن و افکار کی تشنگی و تشفی کا سامان فراہم کیا جاسکتا ہے۔ اس صنف میں شعبہ ہائے حیات سے متعلق تمام تر موضوعات کو احاطہء تحریر میں لایا جاسکتا ہے اور کسی بھی موضوع پر منظم اور مدلل انداز میں معلومات فراہم کی جاسکتی ہیں۔ اسی وجہ سے آج اس تیز رفتار اور آپا دھاپی کے دور میں بھی سنجیدہ قارئین کی نظر میں اس صنف کی اہمیت اور مقبولیت اپنی جگہ قائم ہے۔

قمر جمالی صرف ایک بلند پایہ افسانہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ انھوں نے خاکہ، انشائیے بھی لکھے ہیں۔ مضمون نگاری اور تحقیق و تنقید کی طرف بھی ان کی توجہ ہے اور انھوں نے تبصرے، مقدمے اور تاثرات وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ قمر جمالی نے جن کتابوں پر مقدمے لکھے ہیں ان میں اصناف ادب کے متعلق اپنے نظریے کا اظہار بھی کیا ہے۔ شاہد پٹھان کا تنقیدی نظریہ انھوں نے ان کی کتاب ''ذکر نقد'' کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ قمر جمالی نے شاہد پٹھان کی کتاب ''ذکر نقد'' کے مقدمہ میں اس کتاب کی اہمیت وافادیت کے ساتھ تنقیدی لوازمات کے ساتھ انتقادیات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ انتقادیات ایک پیچیدہ موضوع ہے اس کے تعلق سے لکھنا اور پڑھنا ایک مشکل امر ہے اس کے لیے ادبی صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ ناقد کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ موضوع سے متعلق تمام طول و عرض کے بارے میں واقفیت رکھے۔ اگر شاعری پر تنقید کر رہا ہے تو شعری لوازمات کے ساتھ اس کے فنی اصول پر گہری واقفیت رکھتا ہو۔ انھوں نے اس کتاب کے مقدمے میں تنقید کے تعلق سے لکھا ہے:

> ''انتقادیات ایک جوکھم کا موضوع ہے اس پر لکھنا تو درکنار پڑھنے کے لیے بھی قاری میں تنقید کی مختلف الابعاد کو ہر پہلو سے سمجھنے کی صلاحیت درکار ہے۔ دریں اثناء ایک اچھے ناقد کا ادب کی معنویت، ماہیت، موضوعات کی بوقلمونی اور تنوع، برجستگی اور ٹھہراؤ ادب کے افادی اور تعمیری افکار کی پہچان ہم عصر ادبی رجحانات سے واقفیت، ماضی کے ادبی روایات اور تبرکات پارینہ کا احترام ان تمام امور پر حاوی ہونا ضروری ہے۔'' (انعکاس، از قمر جمالی، ص:۹-۱۰)

قمر جمالی ایک تخلیق کار کی حیثیت سے اردو ادب میں جانی پہچانی جاتی ہیں اور ان کی فنی بصیرت میں تخلیقیت کے عناصر پوری طرح سے پیوست ہیں، اس لیے ان کے

تنقیدی فن پارے میں بھی تخلیقیت کی چاشنی دیکھنے کو ملتی ہے۔ زبان کی مٹھاس سے ان کی تنقیدی عبادت خشک نہیں ہوتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تخلیقی تنقید کی ہم نوا ہیں۔

''ذرہ نقد'' کے مقدمے میں وہ لکھتی ہیں:

''ادب کا بنیادی مقصد ہی تفریح نباہ ہے ادب کی چاشنی اور اسلوب کی شگفتگی علم وآگہی کو باقاعدہ دوام بخشتی ہے۔ یہ چاشنی تخلیق اور تنقید دونوں موضوع میں پائی جاتی ہے۔ ضروری نہیں کہ تنقیدی مواد صرف روکھے پھیکے ہی ہوں یا مواد کی افراط سے بوجھل ہوں۔ شبلی، سرسید، مولانا ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، خواجہ حسن نظامی، ڈاکٹر ذاکر حسین کتنے ایسے ثقہ لکھنے والے ہیں، جنھوں نے سنگین موضوعات کو بھی اپنے لطف گفتار سے نہ صرف شگفتہ بنایا بلکہ انھیں سہل پسند اور سہل فہم بھی بنایا۔'' (انعکاس، از قمر جمالی، ص:۱۴)

ان خیالات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ قمر جمالی ایک ایسی فنکار اور ادیبہ ہیں، جنھوں نے سوکھے میدان میں بھی سبزے کھلائے ہیں اور ہریالی لائی ہیں۔

شاہد پٹھان کی کتاب کے مقدمہ میں انھوں نے شاہد کی تنقیدی بصیرت کو بھی بڑی سنجیدگی سے پیش کیا ہے ساتھ ہی ذرہ نقد کے ابواب بندی کو مقدمے میں رقم کیا ہے۔

شاہد پٹھان کے تین تنقیدی مضامین کو انھوں نے بالترتیب بیان کیا ہے: اول سنگ ذر، دوم راجستھان جدید شعری رجحانات، سوم ذرہ نقد۔ شاہد پٹھان کا تیسرا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں ۱۶ مضامین شامل ہیں، جس میں دس مضامین کو قمر جمالی نے مقدمے میں پیش کیا ہے۔

(۱) مولانا حالی کے تنقیدی نظریات
(۲) رشید احمد صدیقی کی تنقید نگاری
(۳) امداد امام اثر کا اسلوب تنقید
(۴) عبدالرحمٰن بجنوری کا تنقیدی رویہ
(۵) عبدالحق: بحیثیت ناقد
(۶) شباب للت کے شعری امتیازات
(۷) تنقید اصول اور نظریے: ایک مطالعہ
(۸) علقمہ شبلی کا آہنگ غزل
(۹) تفہیم داغ کی ایک تازہ کوشش-اور
(۱۰) مثنوی جہیز کی لعنت کا تنقیدی جائزہ

باقی مضامین کے تعلق سے قمر جمالی نے لکھا ہے کہ وہ مضامین بھی شخصیت اور فن پر ہیں، جس میں شاہد پٹھان نے ادیبوں کے تعارف کے ساتھ ان کی فنی صلاحیت کا احاطہ کیا ہے۔ قمر جمالی اس بات کی طرف مقدمے میں اشارہ کرتی ہیں کہ شاہد پٹھان ایک شاعر ہیں، اس لیے ان کی کتابوں میں شاعری کے تعلق سے مضامین زیادہ ہیں اور شاہد ان مضامین میں شاعری کی واجبات پر مدلل بحث کی ہے۔ شاہد پٹھان کی محنت اور ان کی فنی بصیرت اور لگن کے تعلق سے مقدمے میں لکھتی ہیں:

''اب یہاں ہمارے جواں سال محقق جناب شاہد پٹھان سے کوچہ جاناں کی فراق میں سرگرداں رہنے کی توقع تو کی جاسکتی تھی

مگر ضرب کوہ کن کی سنگینی ناپنے کی امید مشکل تھی مگر شاہد پٹھان نے یہ کر دکھایا باوجود یہ کہ خود ایک تخلیقی فنکار ہیں، انھوں نے تنقیدی صحرانوردی، آبلہ پائی کی جرات کی اور ایک آدھ نہیں بلکہ تین دستاویزی ثبوت دیے۔'' (انعکاس، از قمر جمالی، ص:۱۰)

اس کتاب کے مقدمے میں انھوں نے راجستھان کے ادبی ماحول کا بھی بیان کیا ہے اور راجستھان کے کچھ ادیبوں کا نام بھی گنایا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''حیدرآباد کی طرح راجستھان کی زمین بھی ادبی فضا کے لیے بڑی مردم خیز رہی ہے یہ شہر بھی بادشاہانہ، آمرانہ اچھائیوں او ربرائیوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ سیاسی سماجی حالات جو کچھ بھی رہے ہوں مگر ادب کا اقبال یہاں ہمیشہ بلند رہا۔ والیان ریاست بالخصوص میواڑ، جے پور، ادے پور، بانس واڑہ، پرتاپ گڑھ، جودھ پور، بیکانیر، جیسلمیر، بھرتپورہ، ٹونک، کوٹا اور اجمیر نے اردو ادب کی بڑی آبیاری کی۔ مخمور سعیدی، عقیل شاداب، مظفر صدیقی ، ممتاز شکیب، شاہد عزیز، احتشام اختر، سخاوت شمیم، ش ک نظام اور شاہد پٹھان، یہ ایسے ادیب وشاعر ہیں جنھوں نے اپنے افکار وافعال سے مادر گیتی کا نام روشن کیا ہے۔''

(ایضاً، ص:۱۲-۱۳)

انھوں نے ذرہ نقد کے مقدمے میں شاہد پٹھان کی تنقید نگاری کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے مدلل انداز میں جو اپنا نظریہ پیش کیا ہے، اس سے قمر جمالی کی تنقید کی آگہی، واقفیت وبصیرت کا علم ہوتا ہے۔ اس میں انھوں نے آل احمد سرور کے قول کو نقل کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ بڑا ناقد وہ ہوتا ہے جو اپنا نظریہ پیش کرے اور اس نظریہ سے لوگ مستفید بھی ہوں وہ نقل کرتی ہیں:

''بڑا نقاد وہ ہے جس سے اختلاف تو کیا جائے مگر جس سے انکار ممکن نہ ہو اور جس سے ہر دور میں بصیرت ملتی رہے۔''

آل احمد سرور کے اس قول سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قمر جمالی تنقیدی مبادیات سے بہرہور ہیں اور تنقید کی راہ کا انھوں نے اچھا سفر کیا ہے۔ اس مقدمہ میں جہاں انھوں نے شاہد پٹھان کی کتاب زرہ نقد کے بارے میں معلومات کو صفحہ قرطاس پر لایا ہے وہیں پر انھوں نے تنقید کے خدوخال کو بھی کاغذی پیراہن عطا کیا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قمر جمالی تنقید کے باب میں ایک معتدل ومتوازن نظریہ رکھتی ہیں۔ اس لیے وہ کسی بات یا کسی کتاب پر رائے دینے سے قبل اس سے متعلق تمام تفصیلات کا گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کرتی ہیں، جس کی بنا پر ان کی رائے اور تاثرات سے اس کتاب کی تحقیقی وتنقیدی اہمیت لوگوں میں بڑھ جاتی ہے۔

نسرین صدیقہ، ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد

اردو رپورتاژ کے مجموعے (حیدرآباد کے حوالے سے)

اردو رپورتاژ ترقی پسند تحریک کی دین ہے۔ ترقی پسند تحریک سے قبل اس کی کوئی نمایاں صورت واضح نہیں تھی۔ ترقی پسند مصنفین نے اس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے برتا۔ ان کے لئے فن رپورتاژ نگاری بڑی سودمند ثابت ہوئی۔ ابتداء تا حال رپورتاژ نگاری کے میدان میں کوئی ایسا رپورتاژ نگار نہیں ملتا جو خالص فن رپورتاژ نگاری پر طبع آزمائی کی ہو۔ اس صنف پر ایسے مصنفین نے طبع آزمائی کی ہے جنہوں نے ابتداء سے ہی کسی ناول، افسانہ، سفرنامہ وغیرہ جیسی ادبی اصناف پر معرکے حاصل کر چکے ہوں۔ جن میں سجاد ظہیر، اکرش چندر، عصمت چغتائی، فکر تونسوی، ابراہیم جلیس، قرۃ العین حیدر وغیرہ شامل ہیں۔ رپورتاژ کا وصف حقیقی ہوتا ہے۔ رپورتاژ کے موضوعات، واقعات، کردار ماحول، مناظر اور زمان مکان وغیرہ سب حقیقی اور صداقت آمیز ہوتے ہیں۔ ان سب کے علاوہ محرر کا عینی شاہد ہونا بے حد ضروری مانا جاتا ہے۔ اسی طرح داخلی و خارجی جذبات و احساسات کا اظہار بھی ضروری اور اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ رپورتاژ اپنے عہد کا آئینہ دار اور تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

فنِ رپورتاژ نگاری کے سلسلے میں یہ بات واضح ہے کہ اب تک جتنی بھی کتابیں رپورتاژ نگاری پر لکھی گئی ہیں۔ ان کے مصنف کوئی ماہرِ ادب یا فن کار نہیں بلکہ اردو کے (p.hd) ریسرچ اسکالر ہیں۔ جن میں اولیت کا سہرا ڈاکٹر عبدالعزیز کو ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس:

> "افسوس ہے کہ کسی نے اب تک سنجیدہ علمی نقطہ نگاہ سے رپورتاژ کی صنف کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ ہی اس صنف کی بکھری ہوئی تحریروں کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کام شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کے ایک باشعور اور محنتی ریسرچ اسکالر عبدالعزیز نے انجام دیا۔ "(اردو میں رپورتاژ نگاری از عبدالعزیز، مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی، 1977ء، ص۔9)

اردو میں رپورتاژ نگاری پر لکھی گئی پہلی کتاب (کا عنوان) 'اردو میں رپورتاژ نگاری' ہے۔ اس کے مصنف ڈاکٹر عبدالعزیز ہیں۔ یہ تصنیف 1977ء میں دہلی سے شائع ہوئی۔ اردو میں رپورتاژ نگاری نہ صرف فنِ رپورتاژ نگاری پر لکھی گئی پہلی کتاب بلکہ پہلا رپورتاژی مجموعہ بھی ہے۔ اس تصنیف میں 'عرض حال (عبدالعزیز)'، 'پیش لفظ (ڈاکٹر قمر رئیس)' کے علاوہ تیرہ (13) رپورتاژ شامل کئے گئے ہیں۔ جو مختصر اور ابتدائی دور کے ہونے ساتھ ساتھ تاریخی اور فنی لحاظ سے اہمیت حامل کے ہیں۔ جن میں 'یادیں'، 'ممبئی سے بھوپال تک'، 'ایک ہنگامہ'، 'کہت

کبیر سو بھئی سادھو'، 'پھول کی پتی ہیرے کا جگر'، 'ناچ گیت اور پتھر'، 'سفر ہے شرط'، 'ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس'، 'چھٹا دریا'، 'پھوپٹے'، 'سرخ زمین اور پانچ ستارے'، '۵ دسمبر کی رات' اور 'دلی کی بپتا' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام رپورتاژ مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ فنی اور تاریخی لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔

اس تصنیف (اردو میں رپور تاژ نگاری) کو ترمیمات واضافے کے ساتھ دوبارہ 2005ء کو دہلی سے شائع کیا گیا۔ اس بار عبدالعزیز استاد (شعبہ اردو، اکرحسین کالج، دہلی یونی ورسٹی) کی حیثیت سے اس ایڈیشن کو منظر عام پر لایا۔ جس میں مقدمہ (ڈاکٹر خلیق انجم)، پیش لفظ (پروفیسر قمر رئیس) رپورتاژ: آغاز اور تدریجی منی ارتقاء جیسے مضامین کے علاوہ مزید چار رپورتاژوں کا اضافہ کر کے جملہ 17 سترہ رپورتاژ شامل کئے ہیں۔ پہلی اشاعت میں شامل رپورتاژوں کے علاوہ مزید چار رپورتاژ 'روداد انجمن'، 'رات بیتی پھوپٹی'، 'بلے بلے بھئی امن دی شان رکھ لی' اور 'سقراط کی موت' کا اضافہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اردو میں رپورتاژ کے مجموعے اردو کے منتخب رپورتاژ، رام دین، مختصر سفرنامے اور رپورتاژ وغیرہ منظرِ عام آچکے ہیں۔ اردو رپورتاژ کے مجموعے حیدر آباد کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان میں 'اردو کے شہر اور اردو کے لوگ'، 'رونق ادب'، 'ادبی وتہذیبی رپورتاژ' اور 'کوئی بات اٹھائے نہ رکھنا' منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کر چکے ہیں۔

یوں تو حیدر آباد علم وادب کا گہوارہ ہے۔ اس سر زمین پر اردو نثر ونظم کے بے شمار کارنامے منظر عام پر کام آچکے ہیں۔ شاعری، مضمون، طنز ومزاح، انشائیہ، سفرنامہ، خطوط، ناول، افسانہ تحقیق وتنقید اور رپورتاژ وغیرہ جیسی ادبی اصناف پر طبع آزمائی کی گئی ہے اور اردو زبان وادب کے ارتقاء اور فروغ میں اپنا ایک اہم رول ادا کرتے نظر آتا ہے۔ یہاں اردو رپورتاژ نگاری کا رواج عام ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اور کثرت سے رپورتاژ لکھے جارہے ہیں۔ حیدر آباد کے اردو رپورتاژ نگاروں میں مجتبیٰ حسین، پروفیسر بیگ احساس، قمر جمالی، پرویز یداللہ مہدی، ڈاکٹر رؤف خیر، ڈاکٹر علیم خان فلکی، ڈاکٹر راحت سلطانہ، ڈاکٹر عابد معز، ڈاکٹر ناظم علی، اسلم فاروقی، عبدالعزیز سہیل، محبوب خان اصغر، رفیعہ نوشین، نسیم سلطانہ، معظم راز اور محسن خان وغیرہ شامل ہیں۔ اور رپورتاژ کے مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مندرجہ ذیل میں ان رپورتاژوی مجموعوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جو حیدر آباد کی سر زمین پر (صفِ رپورتاژ نگاری کے میدان میں) اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"اردو کے شہر اور اردو کے لوگ"

ادبی دنیا میں مجتبیٰ حسین کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس مشہور ومعروف شخصیت طنز ومزاح کے میدان میں اپنی ایک منفرد شناخت ومقام رکھتے ہیں۔ طنز ومزاح کے علاوہ انشائیہ، سفرنامہ، خاکہ، کالم نگاری اور پورتاژ نگاری وغیرہ جیسی نثری اصناف پر طبع آزمائی کی۔ مجتبیٰ حسین کا پہلا رپورتاژ 'ایک پلیٹ تخلص بھوپالی' ہے۔ جو موصوف کی پہلی تصنیف "تکلف برطرف" (1968) میں شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین کا مزاحیہ انداز ان کے رپورتاژوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ موصوف کا رپورتاژ اور رپورتاژ کا عنوان دونوں

توجہ کا مرکز دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً ایک پلیٹ تخلص بھوپالی اور جانا ہمارا کلٹک اور پانا خطاب ہاسیہ رتن کا (وغیرہ) ہیں۔ جو مزاحیہ رپورتاژوں کی عمدہ مثالیں ہیں۔

مجتبیٰ حسین سینکڑوں کی تعداد میں رپورتاژ رقم کئے ہیں، جو اردو اخبار و رسائل کی زینت بنے ہوئے ہیں یا ایسا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ اردو اخبار و رسائل کے سمندر میں بکھرے پڑے ہیں۔ جن کے متعلق کوئی خاص واقفیت نہیں ملتی۔ ان میں سے چند کا انتخاب کر کے (جو روزنامہ سیاست میں شائع ہو چکے ہیں) ایک مجموعے کی شکل میں منظر عام پر لایا گیا۔ اس مجموعے کا عنوان "اردو کے شہر اور اردو کے لوگ" ہے۔ 2011ء کو رحیل صدیقی نے مرتب کیا۔

"اردو کے شہر اور اردو کے لوگ" خالص رپورتاژ کا مجموعہ نہیں ہے۔ یہ مجتبیٰ حسین کے رپورتاژ، سفرنامے اور شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس کو دو حصوں میں منقسم کیا گیا۔ پہلا حصہ 'اردو کے شہر' اور دوسرا حصہ 'اردو کے لوگ' ہے۔ پہلے حصے میں پندھرا نمائندہ شہروں (حیدرآباد، دہلی، بمبئی، کولکتہ، چنائی، بنگلور، پٹنہ، لکھنو، پونہ، بدایوں، گلبرگہ، اورنگ آباد، کٹک، بیگوسرائے اور ریاض) کی مختلف ادبی تقاریب کی روداد شامل ہیں۔ جن میں (2 8) اٹھائیس رپورتاژ اور چار (4) سفرنامے ہیں اور دوسرے حصے میں (1 2) اکیس خاکے شامل ہیں۔ اس میں شامل رپورتاژ 1966ء سے 2010ء کا کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ غالباً تمام رپورتاژ سفر سے شروع ہوتے ہیں اور سفر پر ختم ہوتے ہیں۔ اور خالص ادبی بھی ہیں۔ چونکہ مجتبیٰ حسین کا تعلق ادب سے ہے۔ اس لئے ان کے رپورتاژ بھی ادبی میدان تک ہی محدود ہیں۔

"رونقِ ادب"

"رونقِ ادب" ڈاکٹر عبدالعزیز سہیل کا رپورتاژ وی مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز سہیل اردو اصناف ادب جیسے مضامین، تبصرے، تحقیق و تنقید اور رپورتاژ وغیرہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ ادبی نگینے، ڈاکٹر شیلا راج کی علمی و ادبی خدمات، میزان نو، مولوی عبدالغفار حیات و خدمات، سماجی علوم کی اہمیت، مسائل اور امکانات اور رونق ادب وغیرہ تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

'رونق ادب' کی اشاعت 2017ء کو ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی سے ہوئی۔ 144 اوراق پر مشتمل اس تصنیف کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے پہلے حصے میں پیش لفظ کے طور پر تبصرے اور مضامین لکھے گئے ہیں۔ جن کی تعداد پانچ ہیں۔ 'پیش رس از ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم'، 'رونقِ ادب کی رونق از واحد نظام آبادی' اور 'اپنی بات از عبدالعزیز سہیل' اس کے علاوہ دو مضامین 'اردو میں رپورتاژ نگاری کا فن: آغاز و ارتقاء' اور 'رپورتاژ نگاری میں خواتین قلم کاروں کی خدمات' خود مصنف (عبدالعزیز سہیل) کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کل 24 چوبیس رپورتاژ شامل ہیں۔ جو مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان رپورتاژوں میں سمیناروں پر (۱۵) لکچرس پر (چار)، کانفرنس پر (ایک) ادبی تقریب پر (ایک) کتابی میلے پر (ایک) اور کتاب کی رسم اجرا پر (دو) مبنی رپورتاژ شامل ہیں۔ یہ چوبیس رپورتاژ 2011ء سے لیکر 2013ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔ ریاست تلنگانہ میں یعنی حیدرآباد، نظام آباد، ظہیر آباد اور کریم نگر میں منعقد کئے

گئے سمیناروں کی روداد ہیں۔ان رپورتاژوں کا موضوع ادبی سرگرمیوں پر مبنی ہے۔

"ادبی وتہذیبی رپورتاژ"

'ادبی وتہذیبی رپورتاژ' کے خالق ڈاکٹر محمد ناظم علی ہیں۔انہوں نے مضمون نگاری، تبصرہ نگاری، تنقید وتحقیق اور رپورتاژ نگاری وغیرہ پر طبع آزمائی کی۔اب تک ان کی دس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں ۔ادبی وتہذیبی رپورتاژ موصوف کی دسویں تصنیف ہے۔ جو 2018ء کو منظرِ عام آئی۔اس میں 24 رپورتاژ شامل ہیں۔ڈاکٹر ناظم علی کے رپورتاژ جامعات میں منعقد ادبی سمیناروں، اردو اساتذہ کے لئے منعقدہ اردو ریفریشر کورسز اور مختلف ادبی تنظیموں کی جانب سے منعقدہ ادبی اجلاس کی رودادیں ہیں ۔جو 1999ء سے 2018ء کے درمیان منعقد کئے گئے ہیں۔ان کی رپورتاژ نگاری کو سراہتے ہوئے پروفیسر انور الدین لکھتے ہیں:

"ڈاکٹر ناظم علی کی رپوتاژ نگاری کی خاص بات یہ ہے کہ جس اجلاس میں بھی شرکت کرتے ہیں اس روداد کو پہلے محفوظ کرتے ہیں اور پھر جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کرتے ہوئے اپنی تنقیدی رائے بھی دیتے ہیں۔انہوں نے رپورتاژ نگاری میں ایک خاص پہلو نکالا کہ اردو اساتذہ کے لئے جو ریفروش کورس منعقد ہوتے ہیں ان کی تفصیلات بھی رپورتاژ میں پیش کردیں" (ادبی وتہذیبی رپورتاژ از ڈاکٹر ناظم علی، حیدرآباد، 2018، ص۔8)

اس مجموعے میں شامل تمام رپورتاژ کتابی شکل اختیار کرنے سے قبل روزنامہ منصف، روزنامہ سیاست، روزنامہ اعتماد، روزنامہ ہمارا عوام اور روزنامہ ہمارا آندھرا پردیش جیسے مقامی اخبارات میں شائع ہوچکے ہیں۔

" کوئی بات اٹھا نہ رکھنا"

' کوئی بات اٹھا نہ رکھنا ' رفیعہ نوشین کے رپورتاژوں کا مجموعہ ہے۔جو 2019ء کو منظرعام پر آیا ہے۔ اس تصنیف سے پہلے موصوفہ کی دو تصانیف شائع ہوچکی ہیں۔یہ موصوفہ کی یہ تیسری تصنیف ہے۔اور اس کو مصنفہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ۱) تاثرات اور ۲) رپورتاژ۔ پہلا حصہ تاثرات میں (۵) پانچ ادیبوں کے تاثرات یا تبصرے شامل ہیں۔جن میں 'دیباچہ از قمر جمالی'، ' کوئی بات اٹھا نہ رکھنا اور رفیعہ نوشین از اشرف رفیع'، 'شیشہ گروں سا دست ہنر ہے تمہارے پاس از مہتاب قدر'، 'جہد کار کی نامہ نگاری از ڈاکٹر سلیم خاں'، اور 'رپورتاژ نگاری از رفیعہ نوشین' شامل ہیں۔زیر کتاب شامل تاثرات میں ادباء نے اس تصنیف کا مختصر طور پر فنی جائزہ لیتے ہوئے اس کو مستند تصنیف ثابت (دعوی) کیا اور موصوفہ کی تحریروں کو خوب سراہتے ہوئے اس کو ایک ادبی دستاویز کی حیثیت عطا کی۔ دیباچہ میں قمر جمالی لکھتی ہیں:

"یہ کتاب مستقبل کے لئے نہ صرف یادداشتیں ہیں بلکہ ہر دور میں خط اٹھانے کے لائق ہیں کیوں کہ زبان و بیان کے لحاظ سے بہترین فن پارے تو ہیں ہی ساتھ ہی اپنے وقت کی دستاویز بھی ہیں"۔

(کوئی بات اٹھائے نہ رکھنا از رفیعہ نوشین، 2019، حیدرآباد، ص۔10,9)

کتاب کے دوسرے حصے میں (۲۲) رپورتاژ شامل ہیں جن میں مشاعروں پر (چار)، ادبی اجلاس پر (نو)، ادیباؤں کے اعزاز کی نشستوں پر (دو)، ادبی سمیناروں پر (دو)، کتابوں کی رسم اجراء پر (دو)، سماجی پروگرام پر (ایک) نکڑ ناٹک پر (ایک) اور گھریلو بیٹھک پر (ایک) روداد یں شامل ہیں۔ ان بائیس (۲۲) رودادوں میں رپورتاژ کے علاوہ صحافتی انداز کی رپورٹس جیسے 'بزم علم وادب علمبردار اردو، اعزازات میں خواتین نظر انداز اور ادب کا بدلتا منظر نامہ' وغیرہ اور ایک مضمون 'دوست ملاپ' شامل ہیں۔

اس تصنیف کو فنی نقطہ نظر سے پرکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان رودادوں کا موضوع سماجی، سیاسی اور ادبی مجالس ومحافل پر مشتمل ہے۔ جو شہر حیدرآباد میں منعقد ہوئیں۔ یہ رودادیں مختصر ہیں اور عہدِ حاضر (۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۹ء تک) کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

صنفِ رپورتاژ نگاری کو حیدرآباد کے حوالے سے دیکھا جائے (مجموعی طور پر) کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کثرت سے رپورتاژ لکھے جارہے ہیں جو اردو کے متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہورہے ہیں۔ اور ان کو یکجا کر کے کتابی شکل دی جارہی ہے۔ اس طرح رپورتاژوں کو مجموعے (کتاب) کی شکل میں شائع کرنا وقت کے ہاتھوں صنفِ رپورتاژ نگاری کو برباد ہونے سے بچانا ہے۔ مذکورہ صنف کی حفاظت سے تحقیق وتنقید کی راہیں سہل اور ہموار ہونگی جو ترقی کا باعث بنیں گی۔

سردار سلیم۔حیدرآباد

غزل

ٹوٹی ہوئی امید کا ماتم نہیں رہا
عالم تھا جیسا پہلے وہ عالم نہیں رہا

بستی میں آنسو پونچھنے والے نہیں رہے
زخموں کے واسطے کوئی مرہم نہیں رہا

ہر لفظ شعلہ بن کے لپکتا ہے آج کل
ہونٹوں پہ اب دعاؤں کا ریشم نہیں رہا

رت آئی ہے لہو میں نہانے کی دوستو
بارش میں بھیگنے کا وہ موسم نہیں رہا

ان کو بھی اپنے ظلم پہ شرمندگی نہیں
ہم کو بھی سر کٹانے کا کچھ غم نہیں رہا

جلتے ہیں ڈھیٹ ہو کے ہمارے چراغ بھی
اب آندھیوں میں بھی کوئی دم خم نہیں رہا

جو رنگ میری فکر کی پہچان تھا سلیم
وہ رنگ اب غزل کے لئے جم نہیں رہا

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی۔عربی لیکچرار مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

عصر حاضر میں صحافیوں کا کردار اور فضلاء مدارس کی ذمہ داریاں!

زبان وقلم اور عقل ودماغ قدرت کی عطا کردہ نعمتوں میں سے بڑی نعمت وامانت ہیں، جنکی صحیح پرورش وپرداخت اور نشوونما سے انسانوں کو دیگر مخلوقات پر امتیاز وفوقیت حاصل ہوتی ہے، اگر یہی چیزیں تخریبی کردار کی حامل ہوجائیں اور بجائے تعمیری کردار پیش کرنے کے جھوٹی خبریں اور حقائق وشواہد کو توڑ مروڑ کر یا مسخ کر کے پیش کرنے لگے، زبان وقلم سے صداقت، امانت اور شجاعت کے بجائے برائی، بے حیائی اور خیانت کا کام لیا جانے لگے تو ایسے انسانوں کا شمار انسانیت کی فہرست میں نہیں ہوسکتا خواہ وہ کتنا ہی بڑا صحافی یا اینکر کیوں نہ ہو؟ کیونکہ اس نے وسیع تر قومی اور انسانی مفادات کو نہایت گھٹیا اور رزیل فائدے کی خاطر پامال کرنے اور قوموں کے درمیان صلح وآشتی کے بجائے اخلاقی انارکی اور طبقاتی کشمکش کو فروغ دینے کے جرم کا ارتکاب کیا ہے، صحافت کے اصولوں کو توڑا ہے، اجتماعی اقدار کو روندا ہے، اور انسانیت کی خیرخواہی کے بجائے فساد وبگاڑ پیدا کرنے کا کام کیا ہے، اسلئے اب اسکا شمار اشرف المخلوقات کے بجائے اسفل السافلین اور انسانوں کے بجائے جانوروں بلکہ اس سے بھی کمتر درجہ میں ہوگا، خواہ وہ شکل وصورت کے اعتبار سے چلتا پھرتا انسان یا جرنلزم ہی کیوں نہ نظر آئے!! تخریب کاروں کا شمار قوم وملک اور سماج ومعاشرہ کے درمیان ناسور وکلنک کی فہرست میں ہوگا! تاریخ انسانی ایسے بزدلوں اور ضمیر فروشوں کو کبھی معاف نہیں کرسکتی! جس کے پاس نہ تو انسانیت کے تئیں کوئی ہمدردی ہے! اور نہ اسکی صحیح رہنمائی ونمائندگی کا کوئی پاس ولحاظ۔۔۔جس نے چند کوڑیوں میں اپنی غیرت وحمیت اور زبان وضمیر کو فروخت کر ڈالا ہے!! ایسے ضمیر فروشوں کی نازیبا حرکتوں سے قوم وملک کا کل بھی نقصان ہوا تھا اور آج بھی خسارہ ہورہا ہے، کیونکہ صحافت جمہوریت کا وہ چوتھا ستون ہے، جسکا مقصد بہت اعلی وارفع ہے، باقی تینوں ستونوں یعنی عدلیہ، مقننہ اور انتظامیہ بہت اہم ہیں، جو کسی بھی جمہوری ملک کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں، ان میں سے کوئی بھی ستون کو اگر ہمارے برے سلوک وبرتاؤ سے کمزور کیا جائے تو اس سے نہ صرف جمہوریت کی عمارت کمزور ہوگی بلکہ ملک فساد وبگاڑ کی آماجگاہ بن جائے گا۔ کیونکہ جسطرح جمہوری اقدار کی استواری میں صحافت ومیڈیا کا اہم رول ہوتا ہے۔ اسی طرح کامل انسان وصحافی بننے کیلئے افکار وخیالات اور احساسات و جذبات کا صالح ہونا اور صالح مقاصد کیلئے صرف ہونا لازمی شئ ہے، ورنہ وہ معاشرہ میں ایک بیمار شخص اور مریض صحافی ہی کہلانے کا مستحق ہوگا؟! جب تک وہ کہ وہ اپنے دل، آنکھ اور کان کا صحیح استعمال کرنے والا نہ بن جائے۔ بقول قرآن: **لھم قلوب لا یفقھون بھا و لھم أعین لا یبصرون بھاولھم آذان لایسمعون بھا، أولئک کالانعام بل ھم أضل**

کیونکہ صرف زبان وادب اور فصاحت و بلاغت کے جوہر سے متصف ہوجانا اور چکنی چپڑی باتوں سے موہ لینا انکی افضلیت وبرتری ہونے کے لئے کافی نہیں! جب تک ان کی باتوں اور خبروں سے ہمدردی وبھلائی نہ پھیلے، علم و حکمت اور شرافت نہ ٹپکے، انسانیت کیلئے نفع بخش نہ بن جائے اور کسی کیلئے بھی ضرر رساں نہ ثابت ہو، اسی کے ساتھ وہ اپنے خالق ومالک کی معرفت رکھے اور اس کا ہر حکم بجالائے، زمین میں فساد وبگاڑ کا ہرگز کوئی راستہ ہموار نہ کرے، ایسے لوگوں کو ہمدرد انسانیت، خیرخواہ قوم وملک اور صحافت وذرائع ابلاغ کا سچا پیامبر اور امین ودیانت دار صحافی وجرنلسٹ سے موسوم کریں گے۔ سماج ومعاشرہ کو مختلف برائیوں اور خامیوں سے نجات دلانے، ناپ تول میں گڑبڑی سے روکنے، بندوں کی غلامی سے آزاد کرانے، انسانیت کی صحیح رہنمائی کرنے اور خالق ومخلوق کا رشتہ مستحکم کرنے کے عظیم الشان مناصب وذمہ داریوں کیساتھ مختلف وقتوں میں ہزاروں انبیاء کرام اور رسولوں کا سلسلہ جاری کیا گیا اور آسمانی کتابوں کے ذریعے خالق ومخلوق کے درمیان ابلاغ وترسیل کا خدائی نظام قائم کیا گیا تاکہ انسانیت کو صحیح رہنمائی حاصل ہو، قوم وملک کو بھلائی حاصل ہو، مخلوق خدا کو معاشی، اخلاقی اور ایمانی ترقی حاصل ہو، فساد وبگاڑ کا خاتمہ ہو اور عدل وانصاف کا متوازن ومعتدل نظام قائم ہو، تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کو وہ پیغام پہونچا دیا، وحی کے ذریعے ابلاغ وترسیل کا یہ ربانی سلسلہ بھی نبی آخرالزماں پر مکمل کردیا گیا، خدا کا شکر ہے کہ بہترین وخوشگوار زندگی گزارنے کے واسطے وہ تمام ضروری چیزیں ہمارے درمیان اب تک بعینہ موجود ہیں، صرف نبی کی ذات وشخصیت روپوش ہے، نبی خاتم کی مکمل سیرت، صحابہ اور اولیاء کے نقوش، حق پرست علما وصلحا کا صالح کردار، قرآن جیسا دستور حیات، حضور کے تمام ارشادات وفرمودات بعینہ دستیاب ہیں، غرض کی مخلوقات کی بھلائی وکامیابی کی وہ تمام چیزیں بشمول اقدار و اخلاق موجود ہیں مگر انسانوں کو انکے ہاتھوں کے کرتوتوں، مظالم وجرائم اور جہالت وسفاہت کے رویوں نے ان کو انسانیت کے اسباق پڑھ کر نصیحت حاصل کرنے سے روک رکھا ہے! اسی لئے وہ نعمتوں کی ناقدری اور امانتوں میں خیانت کا ارتکاب کررہا ہے، قرآن کا فرمان بالکل درست ہے: جسکا مفہوم ہے "بیشک ہم نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر امانت پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس امانت کو اٹھالیا، بیشک وہ زیادتی کرنے والا، بڑا نادان ہے"۔ آج ہمارے عمل اور رویے سے اس بڑی امانت ودیانت کیساتھ جو خیانت وکوتاہی ہورہی ہے۔ وہ اسی کردار کی جھلک اور تصویر ہے جو صحافت اور ذرائع ابلاغ کے میدان میں یہاں وہاں نظر آرہی ہے۔

انسان کے جسم میں دو چیزیں ایسی ہیں جن پر کنٹرول سے اسکی شخصیت نکھرتی ہے اور بے احتیاطی سے مجروح ہوتی ہے، پہلی چیز اس کی زبان دوسرا اس کا دل ہے، باقی تو وہ گوشت پوست کا مجموعہ ہے، اسی بات کو جاہلی دور کے بڑے شاعر زہیر بن ابی سلمی نے صاف صاف بتادیا ہے۔ لِسَانُ الفَتَى نِصْفٌ وَنِصْفٌ فُؤَادُهُ..... فَلَمْ يَبْقَ إِلَا صُورَةُ اللَّحْمِ وَالدَّمِ. یہ حقیقت بھی ہے کہ کسی انسان کی صحیح پہچان اسکے ساتھ دوستی یا اسکی زبان وبیان، اس کی فکر ونظر اور اسکے دل ودماغ کی زہریلی حرکتوں یا اسکی صحیح ترجمانی سے ہوتی ہے، صحافت، پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا، ویب میڈیا،

سائبر میڈیا، سوشل میڈیا یعنی ذرائع ابلاغ وترسیل کے ماڈرن طریقے ہیں جو اسی زبان ودل کی صحیح یا غلط ترجمانی، حقائق کی من وعن یا الٹی تصویر کشی کی شہادت دیتی ہے، افسوس کہ موجودہ دور میں انسانیت کی خیرخواہی کی صحیح نمائندگی کرنے والے میڈیا کے اہل کار بھی دل میں بغض، حسد، کینہ رکھ کر اپنی زبان ومنہ سے ایسی منافقت ظاہر کررہے ہیں کہ جس سے ترقی یافتہ دور اور میڈیا کی تمامتر سہولیات کی ایک طرف بڑی بدنامی بھی ہورہی ہے اور دوسری طرف بیجہتی و یگانگت پیدا ہونے کے بجائے بڑا فساد برپا ہونے کا خطرہ لاحق ہوگیا ہے، حالانکہ قدیم زمانے میں یہی کام ذرائع و وسائل کے فقدان کے باوجود قدرتی اور فطری طریقوں پر رائج تھا اور درست طریقے پر سب کام انجام پارہا تھا، کبھی تابوت سکینہ اور اسمیں بند تمام انبیاء کرام اور انکے مکانات کی قدرتی تصویریں، تختیاں اور اس صندوق کے بابرکت نظارے وکرشمے کے ذریعے ہوتا تھا، ہدایت ورہنمائی کے واسطے آسمانی صحیفوں اور کتابوں کا انبیاء پر نزول ہوتا رہا، جس میں دنیائے انسانیت کیلئے سماجی، ملی، اخلاقی، ایمانی، انسانی اور اجتماعی رہنمائی وبھلائی کا پورا نظام رہتا تھا، جس میں کسی مکروفریب کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ مگر آج تمام ترقیوں کے باوجود صحافت وذرائع ابلاغ کا پورا نظام قابل افسوس ہی نہیں بلکہ ماتم ونوحہ گری کی حد پہونچ گیا ہے۔ بقول غالب:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں۔۔۔

ذرائع ابلاغ وترسیل کا یہ سلسلہ جب خطوط نویسی کے ذریعے رائج رہا تو کبھی پیغام رسانی کے کاموں میں بگاڑ پیدا نہیں ہوا، حتی کہ جانوروں اور پرندوں نے بھی اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ولاپرواہی نہیں کی، مگر آج کا انسان تو کوتاہی و لاپرواہی تو درکنار نفرت وعداوت کی بیج بونے میں شیطانوں کو بھی مات دے دیا ہے، غرض کہ ابلاغ وترسیل کا نظام قیام کائنات سے لے کر اب تک قائم ہے، پہلے زمانے میں بالکل خالص اور پاک وصاف تھا، مگر اب اسکا دائرہ جتنا وسیع ہوا ہے اتنا ہی اسمیں فساد وبگاڑ اور گراوٹ وملاوٹ پیدا ہوگئی ہے، گودی میڈیا کیساتھ ساتھ سوشل میڈیا نے بھی ہر طرف افواہوں اور جھوٹی خبروں کو پھیلا پھیلا کر صحافت کے اصولوں کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیا ہے، قوم وملک کیلئے امن وامان پیدا کرنے کے بجائے نئے نئے مسائل ومشکلات کا دروازہ کھول دیا ہے، اربابِ اقتدار وعدلیہ کیلئے اب یہ مسئلہ بڑا سردرد بنتا جارہا ہے، جس پر اگر اور ابھی مکمل کنٹرول حاصل نہیں کیا گیا! اور جھوٹوں کے بازاروں کو بند نہیں کرایا گیا تو کل اس پر کنٹرول پانا بہت مشکل امر بن جائے گا۔ کیونکہ کسی بھی ملک اور اسکے ترقیاتی نظام کی کامیابی کا انحصار معاشی واقتصادی، سیاسی وسماجی اور اخلاقی ومعاشرتی اور تعلیمی وتربیتی نظام پر منحصر ہے، مگر یہاں تو ہر میدان میں گراوٹ وملاوٹ پیدا ہوگئی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں!

ہمارے ملک کی یہ بہت ہی تشویشناک اور اندوہناک صورتحال ہے کہ انسانی فلاح وبہبود اور عدل و انصاف کے نظام کو فروغ وترویج دینے اور حقائق وشواہد کی روشنی میں قوم وملک کی صحیح رہنمائی کرنے اور حقیقت وسچائی سے واقف کرانے والے صحافتی اور ترسیلی اداروں کو سیاسی شعبدہ بازوں، فرقہ پرستوں اور ملک دشمن عناصر نے اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے معمولی پیسوں میں خرید رکھا ہے اور خود انحصار ہندوستان کا نعرہ بلند کررہے ہیں! جمہوریت کے اہم ستونوں کو جو دیمک کی ہڈی کی مانند ہے ان

کو بھی اب گھن کھاتے جارہا ہے اور طاقتور اور سپر پاور ہندوستان کا خواب دکھا رہے ہیں! میڈیا جس کا مشن ملک میں امن وامان کو بحال رکھنا، انتشار وافتراق کے مذموم ومسموم لعنت سے قوم وملک کو بچانا، یکجہتی ویگانگت، اخوت و مودت اور بھائی چارے کی فضا کو خوب فروغ دینا تھا اب اسکی بھی بنیادیں ہل کر رہ گئی ہیں اور اینکروں، صحافیوں اور رپورٹروں کے رویوں اور انکے مشکوک کردار سے ملک کمزور پر کمزور ہوتا جارہا ہے، دل میں نفرت و عداوت کی آگ پوشیدہ ہے اور زبان پر سب کا ساتھ سب کا وکاس اور سب کا وشواش کا نعرہ ہے، ایسا لگتا ہے کہ صحافت کے ان اہل کاروں کی تھیوری اور پریکٹیکل میں جو کمی واقع ہوئی تھی اس کی یہاں کھلی بے وقوفی جھلک رہی ہے، اسی لئے آنکھ میں دھول جھونکنے کیوجہ سے اسکو گودی میڈیا یا لیپ ڈاگ میڈیا کا حقارت آمیز لیبل یا خطاب سے نوازا گیا ہے؟!

صحافت ومیڈیا کے میدان میں پیسوں کے بل بوتے اور ارباب اقتدار کی خواہش ومرضی پر یہ ساری بے اصولیوں اور بے اعتدالیوں کا ارتکاب کیا جارہا ہے، جس کیوجہ سے ملک میں امن وامان، اتحاد واتفاق عدل وانصاف اور انسانی اقدار کا توازن بگڑ کر رہ گیا ہے اور نفرت وعداوت کی فضا سے ملک کو بڑا خطرہ لاحق ہوگیا ہے! جیسی نیت ویسی برکت کے نتیجے میں ملک میں مہنگائی پر مہنگائی بڑھتی ہی جارہی ہے! اقتصادی ومعاشی بدحالی اور بے روزگاری میں روز بروز کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے! یہ سب پیسوں کی خاطر معدہ وپیٹ کو تسکین دینے اور انسانیت پر ظلم وستم ڈھانے کا نتیجہ ہے، افسوس کہ میڈیا کی تمام اقسام، اینکروں اور صحافیوں کا رول اتنی خطرناک حد تک پہنچ گیا ہے! اور نفرت و عداوت کی ہوا نے صدیوں سے قائم اخوت ومودت کی فضا کو اسقدر مکدر کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے ہزاروں کارنامے اور قربانیوں کے باوجود برادران وطن کی نظروں سے انکے کارنامے اوجھل ہوتے جارہے ہیں! دستور میں آزادی وروادری کی شقوں کے باوجود ان کے مذہب و شعائر کا احترام بھی باقی نہیں بچا ہے! روز بروز مظلوم مسلمانوں کی حقوق تلفیاں بڑھتی جارہی ہیں، ان کی جان، مال اور عزت وآبرو کو نیلام کرنا اب کوئی مشکل کام نہیں رہ گیا ہے، ظالموں اور بدخواہوں کی مدد واعانت کی جارہی ہے، حقائق وشواہد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف ملک میں جو پروپیگنڈے اور سازشیں اور حربے اختیار کیے جارہے ہیں، وہ زرد اور بکاؤ صحافت، اسکی گرما گرم ڈبیٹ اور اسمیں شریک زرخرید غلاموں اور صحافیوں کا منافقانہ اور متعصّبانہ کردار نہیں تو اور کیا ہے؟!

اب تو مسلم حکمرانوں کے نام پر الزام تراشی اور بہتان طرازی کے ذریعے مسلم قوم کو ٹارگٹ کرنا اور ان سے لوگوں کو بدظن وبدگمان بنانا، ان کی بڑھتی آبادی سے ڈر اور خوف پیدا کروانا، اور ان کے خلاف نفرت وعداوت کی فضا کو قائم کروانا ہے تاکہ اس طرح سے فرقہ پرستوں کو انکے مفادات حاصل ہوسکیں، تخریبی کاموں میں انکو کامیابی مل سکے، ملک کو ہندو راشٹر میں تبدیل کیا جاسکے! یکساں سول کوڈ کا نفاذ عمل میں آسکے اور مسلمانوں کو دہرے معیار کے شہری کی فہرست میں شامل کیا جاسکے۔ مسلم مخالف تمام کاموں میں زرد صحافت کا کردار پوشیدہ ہے، اسی لیے بات بات میں مسلمانوں کو تو گرفتار کیا جارہا ہے، ان کے خلاف تمام دفعات کا نفاذ تو ہورہا ہے، مگر کوئی مسلمانوں کے مقتدر ومعزز شخصیت

کے خلاف نازیبا اور گستاخانہ بیان دے تو ہزار مطالبے اور دستوری احتجاج کے باوجود اصل مجرم کی گرفتاری عمل میں نہ آسکے، ظلم کے خلاف دستوری طریقے سے صدائے احتجاج بلند کرنے والوں پر گولیاں برسائی جائیں! مسلمانوں کی ہی گرفتاریاں عمل میں آئیں! بلڈوزر سے ان کے گھروں کو ڈھا دیا جائے! جانبدارانہ ظلم وزیادتی کی ایسی انتہا کردی جائے! کہ سپریم کورٹ کا اگر کوئی فاضل جج ملک میں ہورہے مظالم کا جائزہ یا نوٹ لے یا ملک کی تازہ صورتحال پر اپنا حقیقت پسندانہ بیان جاری کرے تو ان کے خلاف بھی میڈیا میں ہرزہ سرائی شروع ہوجائے! نپور شرما کا مسلمانوں کی مقتدر شخصیت اور نبی آخرالزمان کی شان میں گستاخانہ بیان کیوجہ سے اندرون وبیرون ملک میں جو حالات پیدا ہوئے اور اس سلسلے میں میڈیا، مقننہ اور انتظامیہ کا جو کردار اور رول رہا، سب قابل غور وفکر اور تشویشناک ہے؟!

اندازہ لگایئے! کہ ہمارا ملک کہاں پہنچ گیا ہے کہ فاضل جج کو بھی حق بات پیش کرنے کیوجہ سے بیجا تنقیدوں اور اہانت آمیز رویوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، تو مظلوم ونہتے مسلمانوں اور ان کے بہی خواہوں کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہوگا!! ایسے متعصبانہ رویے اور ظالمانہ سلوک وبرتاؤ کا ماحول آخر کیسے اور کیوں کر پیدا ہوا؟! یہ سب میڈیا کی غلط بیانی اور غلط ترجمانی کا نتیجہ ہے، اگر زبان وقلم اور ذہن ودماغ کو ان خطوط ونقوش پر ڈھالا نہیں گیا! جن کا مطالبہ اچھی صحافت و میڈیا کا کردار کرتا ہے، انبیاء کی سیرت اور آسمانی کتابوں کا پیغام کرتا ہے، صحابہ اور اولیاء اللہ کی سیرت وسوانح کرتی ہے اور علماء وصلحاء کی زندگی کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارے ملک کا جمہوری آئین ودستور کرتا ہے۔۔۔ آج ملک میں صحافت ومیڈیا اپنے ان اہم مقاصد سے ہٹتا نظر آرہا ہے، جن سے ایک اچھے صحافی ورپورٹر کے کردار کی شناخت ہوتی ہے۔ درست خبریں بہم پہنچانا، عوام کی سیاسی تربیت کرنا اور انسانیت کی اجتماعی واخلاقی رہنمائی کرنا، قارئین کرام کے ذوقِ سلیم اور اخلاق کریمانہ کو نکھارنا اور عام لوگوں کی تفریح طبع کے لئے عمدہ مواد فراہم کرنا ہی ایک اچھے صحافی کا بہترین کردار ہوتا ہے اور یہی ہونا بھی چاہئے۔ آج بھی عوام وخواص میں وہی صحافی اور اخبارات زیادہ مقبول ومعروف ہیں جنکی باتوں اور کوششوں میں زیادہ سچائی ودیانت داری، جن کی رپورٹنگ میں حقائق کی عمدہ تصویر کشی ہوتی ہے، جو معاشرہ وسماج میں محبت والفت کی بیج بوتے ہوئے صحیح خبریں بہم پہنچاتے ہیں، کیونکہ اس عمل میں عام لوگوں کی اچھی تربیت بھی ہوسکتی ہے اور بری تربیت بھی، ان کا ذوق بلند وبالا بھی ہوسکتا ہے یا پست ورزیل بھی۔ ان کا اخلاق سنوارا بھی جاسکتا ہے یا بگاڑا بھی، اخبارات کا بنیادی کام اپنے قارئین کو درست اطلاع بہم پہنچانا اور پوری دنیا کے احوال سے انہیں باخبر رکھنا ہے، دنیا کے جس حصے میں بھی کوئی واقعات ظہور پذیر ہورہے ہوں، وہاں کی تبدیلیوں اور مختلف شعبوں میں جو جو ترقیات ہورہی ہوں، ان سب چیزوں سے عوام وقارئین کو واقف کرانا۔

موجودہ دور مسلمانوں کے لئے بڑے بڑے چیلنجز رکھتا ہے، پھر بھی مسلمان قوم تعلیم وتربیت میں کافی پیچھے ہوگئے ہیں، اسی طرح صحافت کے میدان میں بھی ان سے نبیوں کے کردار کی بھرپور نمائندگی کا مطالبہ ہے، حیف صد حیف کہ مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی معقول ''میڈیا ہاؤس'' بھی نہیں ہے، یہ المیہ صرف کسی ایک مخصوص خطے، علاقے یا ملک تک ہی

محدود نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کی یہی صورتحال ہے، البتہ کچھ اخبارات یا ٹی وی چینلز ہیں، جسے ہم آٹے میں نمک کے برابر ہی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے پاس قابل اعتماد اور باشعور صحافیوں کی کوئی ٹیم بھی نہیں ہے، جن کی آواز مغرب سے مشرق اور شمال سے جنوب تک گونجے اور مؤثر انداز میں سنی وتسلیم کی جائے۔ جو حضرات وخواتین بھی اس میدان میں ہیں، ان میں سے اکثر کے لیے یہ صحافت کوئی مشن اور خدمت کا درجہ نہیں رکھتی! بلکہ وہ محض ایک پیشہ کے طور پر اس سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر کوئی صحافی ہمت وجرأت کیساتھ اپنے سماج اور قوم وملت کے مفاد میں حق کی ترجمانی کرنا چاہتا ہے تو ان کو میڈیا ہاؤس کی پالیسیاں خاموش کردیتی ہیں یا وہ کسی بہانے میں گرفتار کر لئے جارہے ہیں جیسا کہ ابھی محمد زبیر، شرجیل امام اور دیگر نوجوانوں کیساتھ پیش آیا ہے۔

یہ ہماری بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ علماء کرام اور دینی مدارس کے فضلاء جو انبیاء کے سچے وارث اور پکے امین ہیں، جن کے کاندھوں پر انسانیت کی فلاح وبہبود اور خیر خواہی کی ذمہ داریاں عائد ہیں، جن کے وجود کا بنیادی مقصد ہی انسانیت کی خیر خواہی اور جبر واستبداد کے پنجے سے آزاد کرانا ہے، عدل وانصاف کی فضا قائم کرنا ہے، سماج ومعاشرے کو امن وامان کا گہوارہ بنانا ہے، وہ فضلاء قوم وملک میں صحافت کیلئے صحیح ترجمانی سے قاصر ہیں۔ طالبان علوم نبوت کو سمجھنا چاہیے کہ اس دور میں مسلمانوں کیلئے سب سے بڑا چیلنج بگڑتا میڈیا اور جھوٹی خبریں پھیلانا ہے، انسانیت کی بدقسمتی یہ ہے کہ میڈیا کا مؤثر ترین اور طاقتور ہتھیار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے، جن کے پاس نہ ہی انسانیت کی ہمدردی ہے اور نہ کسی کے خون پر تڑپنے والا دل ارجمند! نہ انسانیت کی فلاح وبہبودی اور تعمیر وترقی کا کوئی منصوبہ وپلاننگ ہے! اور نہ بے روزگاری وبھکمری دور کرنے کا کوئی تجربہ! پھر بھی میڈیا کی طاقت وقوت کو تعمیر ملت کے بجائے تخریب کاری، اخلاق وکردار کو سنوارنے کے بجائے بے حیائی وبداخلاقی کو فروغ دینے اور انسانوں کی رہنمائی کے بجائے انہیں راہ حق سے گمراہ اور الحاد وبے دینی عام کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے؟!

ایسے میں فضلاء مدارس اور طالبان علوم نبوت کی ذمہ داریاں دوچند ہوجاتی ہیں۔ قوم وملت کی خدمت کے جذبے کے ساتھ اگر وہ میڈیا یا صحافت کو بطور مشن یا پیشہ اختیار کرلیتے ہیں تو اس کے بہت سارے فوائد نمودار ہونگے۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوگا کہ پریشان حال انسانیت کو سچے اور دیانت دار افراد وفضلاء مل جائیں گے جن کے دلوں میں خدا کا خوف ہوگا، جو با اخلاق وباکردار اور نبی کے سچے پیروکار ہونگے اور ان کی سیرت کے حامل بن کر صحافت کو جھوٹ وفریب کے پلندہ سے نکال کر صحیح رخ پر گامزن کریں گے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ حاصل ہوگا کہ دعوت وتبلیغ کو بھی ایک وسیع میدان اور طالبان علوم نبوت کی رہنمائی حاصل ہوجائیگی۔ جہاں سے انہیں قومی زبان وادب میں دین کا خالص پیغام پہنچانے کا بھرپور موقع مل جائے گا۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہوگا کہ زہریلے میڈیا کے ذریعہ برادران وطن اور مسلمانوں کے درمیان جو خلیج پیدا کی جارہی ہے، اس کو یکجہتی ویگانگت اور اخوت ومودت کی لڑیوں میں پروسکیں گے۔ تیسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ دینی مدارس کے فارغین کیلئے اسوقت معاش کا مسئلہ سب سے بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے، اس اسٹیج سے ان کی صلاحیت وقابلیت کے حساب سے معیشت کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔ نیک جذبے اور خلوص نیت کے ساتھ اس پیشے کو اختیار کیا جانا قوم وملک کیلئے نہایت

ضروری ہے اور انسانیت کیلئے بھی بہت بڑی خیر خواہی ہوگی اور رزق میں کشادگی کے بھی ذرائع مہیا ہوجائیں گے۔

سازش و پروپیگنڈے کے اس دور میں دینی مدارس کے فضلاء کیلئے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے شوق و دلچسپی کا مظاہرہ کریں اور یونیورسیٹیوں میں جرنلزم کے شعبے سے جڑ کر اس میدان میں قابلیت پیدا کریں اور اپنی صلاحیتوں اور کوششوں سے صحافت کے مختلف میدان میں ایک انقلاب برپا کردیں، اگر کسی فاضل وفعال نوجوان طالب علم کے پاس لکھنے کی صلاحیت ہے اور وہ اچھے مقالات ومضامین، شعر و شاعری اور واقعات وکہانیاں لکھ سکتے ہیں تو اس کے لئے پرنٹ میڈیا کا میدان بہت وسیع وعریض ہے۔ اخبارات کے مختلف کالموں میں وہ لکھ سکتے ہیں، سیاسی و مذہبی، علمی وادبی، تجارتی و سائنسی، فنون لطیفہ وفیشن اور کھیل کود وغیرہ میں اپنی قسمت آزمائی کرسکتے ہیں۔ دینی ومذہبی رجحانات کے بہت اخبارات و رسائل موجود ہیں، ان میں مذہبی و ثقافتی مضامین، اسلامی تاریخ، دینی مسائل، بچوں کے ادب میں اسلامی کہانیاں اور خواتین سے متعلق مضامین، مستند اور دلکش طرز تحریر میں پیش کرسکتے ہیں، اسی طرح عربی صحافت سے استفادہ کرتے ہوئے کسی بھی طرح کے مضامین مختلف زبانوں میں ترجمے کرکے اپنی انفرادیت قائم کرسکتے ہیں، اس سلسلے میں اگر طالبان علوم نبوت کا شعور واحساس بیدار نہ ہوا اور اس فتنے کا مقابلہ کرنے کیلئے وہ تیار نہ ہوئے اور سماجی وسیاسی، اخلاقی و ایمانی اور انسانی واجتماعی خدمات کا بیڑہ نہ اٹھایا تو بہت ممکن ہے اس غفلت کے نتیجے میں ملک میں ایک بڑا فساد برپا ہوجائے گا اور پورا نظام درہم برہم ہوکر رہ جائیگا۔۔۔ لاقدر اللہ لذلک۔۔۔ اللہ ہماری ہر طرح سے مدد فرمائے۔

ڈاکٹر رحیم رامش۔ حیدرآباد

تری مسکراہٹ

بہت خوبصورت تری مسکراہٹ
خوشی کی علامت تری مسکراہٹ
دھنک کی سی رنگت تری مسکراہٹ
گلوں کی نزاکت تری مسکراہٹ
مرے دل کی راحت تری مسکراہٹ
سدا دیتی لذّت تری مسکراہٹ
ہے چاہت ہی چاہت تری مسکراہٹ
محبت محبت تری مسکراہٹ
جو دیکھی ہے خلقت تری مسکراہٹ
بنی سب کی حیرت تری مسکراہٹ
حسینوں میں چرچا بہت ہی ہے اس کا
بہت پا لی شہرت تری مسکراہٹ
اِسے دیکھتا ہی رہوں میں مسلسل
ہے آنکھوں کی جنّت تری مسکراہٹ
ترا حسن ہر دم یہی تو بڑھائے
بدن کی ہے زینت تری مسکراہٹ
تجھے مسکراتا ہوا جب بھی دیکھا
بڑھائی ہے ہمّت تری مسکراہٹ
نہ ہیرے نہ موتی نہ سونا نہ چاندی
مری ہے یہ دولت تری مسکراہٹ
ہمیشہ یہی فکر رہتی ہے رامش
نہ کردے شرارت تری مسکراہٹ

ڈاکٹر علیم خان فلکی۔صدر سوشیو ریفارمس سوسائٹی، حیدرآباد

چٹ نکاح پٹ ولیمہ۔ کیوں نہیں؟

لوگ بھی عجیب ہیں۔ بھوک کا رونا روتے ہیں، انہیں روٹی پانے کا راستہ دکھاو تو اسے شدت پسندی، بے جان اور بے وزن مہم قرار دے کر من وسلویٰ کی خواہش کرتے ہیں۔ من وسلویٰ بہم پہنچانے کے لئے پیغمبر کا آنا لازمی ہے، لہذا نہ اب کوئی پیغمبر آئیں گے اور نہ لوگوں کی خواہشات پوری ہوں گی۔ اپنی اپنی پسند اور اپنے مزاج کا دین چلتا رہے گا۔

بات اتنی سی تھی کہ نکاح اور ولیمہ دونوں ایک ہی وقت منعقد ہو جائیں تو اس سے نہ صرف بے شمار خرافات اور منکرات کا خاتمہ ہو جاتا ہے بلکہ لاکھوں گھرانوں کو غربت و افلاس سے نجات بھی مل سکتی ہے۔ یوں تو ایک پان کے ڈبے والے سے لے کر ایک کروڑ پتی تک ہر شخص نکاح کو آسان کرنے کے دانشورانہ تکیہ کلام کی جگالی کرتا ہے لیکن جب کسی خرافات سے بھرپور شادی کا دعوت نامہ آتا ہے تو اس کا دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ رقعہ کھول کر پہلے ''تناول طعام'' اور ''ولیمہ'' چیک کرتا ہے، صدیوں سے لذیذ کھانوں کی اِس بھوکڑ قوم کو دعوت نامے کے ایک ایک لفظ سے بریانی، بگھارے بیگن اور شاہی ٹکڑوں کی پاگل کر ڈالنے والی خوشبو آنے لگتی ہے۔ ایسے وقت میں وہ نکاح کو آسان کرو کا کلمہ بھول جاتا ہے اور یاد رہتا ہے تو صرف دعوت قبول کرنے کی سنّت۔ ہمارے مولویوں نے بھی پیٹ بھرنے والی ہر سنّت کو خوب دماغوں میں بٹھایا ہے۔ صرف شادیاں ہی نہیں بلکہ عرس، چہلم، برسی، برتھ ڈے، گیارہویں، کونڈے، افطار پارٹیاں، عیدملن، چھلّہ، چھٹّی، عقیقہ، بسم اللہ، ہر موقع کی مناسبت سے ہمارے مولویوں کے پاس کھانے کا جواز ہے۔ کھانے کے لئے مرجانے والی قوم کہیں نہ کہیں سے جواز نکال لاتی ہے۔ حتّٰی کہ جس گھر میں میت ہو جائے، لوگ تدفین کے بعد اپنے گھر واپس نہیں جاتے بلکہ میت کے گھر کھانے کے لئے آدھمکتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ کھانے کی دعوت قبول کرنا سنّت ہے۔ اب ایسی قوم سے شادی کے کھانے چھوڑنے کی امید کرنا یقناً سعیٔ لاحاصل ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک شخص گُٹکا کھانے کی وجہ سے کینسر کے آخری اسٹیج پر پہنچ چکا ہے، لیکن وہ گُٹکا چھوڑنے تیار نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ''میں اپنی شادی سے لے کر دادا و نانا بننے تلک یہ کھاتا رہا ہوں''، اسی طرح کوئی شخص جسے ہائی شوگر کی وجہ سے میوے کھانا بھی سخت منع ہے، لیکن وہ کہتا ہے کہ میں شادی سے لے کر دادا و نانا بننے تلک میوے حرام نہیں تھے، اب حرام کیسے ہو سکتے ہیں؟ اب اسے کون سمجھائے کہ یہی حلال میوہ شوگر کے مریضوں کے لئے خودکشی کا ذریعہ بنتا ہے اور خودکشی حرام ہے۔

نکاح کے فوری بعد ولیمہ کرنے پر لوگوں کو سخت اعتراض ہے سوال یہ ہے کہ ولیمہ کو اگلے دن ہی کرنے کی لاجک کیا ہے۔ چونکہ معترض نے اس مسئلے پر شرعی احکامات کی باریکی کی تحقیق کئے بغیر ایک مزاحیہ کالم میں معمولی عقلی سطح

کی پتنگ اڑائی ہے اس لئے ہم بھی معمولی عقلی کی ہی پتنگ لڑائینگے، ورنہ اگر شرعی احکام کا مانجہ لگائیں گے تو ان کی بغیر مانجے کی پتنگ ایک آن میں ہوا ہو جائیگی۔

سنّتوں سے لوگوں کی محبت پر ہمیں بڑا رشک آتا ہے جب وہ ولیمہ کو اگلے دن ہی کرنے پر بضد ہوتے ہیں۔ جس طرح برہمنوں اور شودروں کی مندریں الگ ہوتی ہیں، اسی طرح سنّتوں کی محبت میں ہمارے دینداروں کی بھی مسجدیں الگ ہیں، فرقے، لباس، رنگ اور حلیئے الگ ہیں، اور معاملہ جب اگلے دن ولیمہ کرنے کا آتا ہے تو بات صرف سنت تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس میں عقیدہ بھی شامل ہو جاتا ہے، اسی لئے بوڑھیوں کے بھی دماغ میں یہ بٹھا دیا گیا کہ بقول حضرت معترض کے وہ کہہ اٹھتی ہیں ''ائی ماں؛ کیا بے صبرا دلہا ہے، اجاڑ، ذرا تو صبر کرنا، سیم ٹائم نکاح اور ولیمہ کتے۔۔۔۔''

ہر سنّت کے پیچھے ایک منشائے شریعت ہوتی ہے جس کو علما علّت یا حلت کہتے ہیں۔ اس کو سمجھے بغیر سنت پر عمل کرنا ایسا ہی ہے جیسے شوگر کے مریض کو محبت میں خوب شوگر کی چائے پلاتے جانا۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں نکاح بات چیت کے موقع پر ہی پانچ دس افراد کی موجودگی میں ہو جاتے تھے۔ لڑکی والوں سے کھانا لینے کا دور دور تک کوئی تصور نہیں تھا، اس لئے اگلے دن ولیمہ کا اعلان ہوتا تھا۔ بلکہ ولیمہ نام ہی اعلان کا ہے۔ یہی سنت ہے۔ ولیمہ کا اصل مقصد اعلان ہے نہ کہ وقت۔ لیکن اگر آج کی طرح نکاح کے دن ہی لڑکی کے باپ کے خرچ پر سینکڑوں کی تعداد میں لوگوں کو جمع کر لیا جائے تو اعلان خود بخود ہو چکا، اب مزید اعلان کرنے کا کیا تک ہے؟ اور سنّت کی محبت کے دعویداروں سے یہ بھی سوال ہے کہ جب سیرت میں بارات کا کے کھانے کا کوئی وجود نہیں تو ولیمہ اگلے دن کر کے نکاح کے دن کا کھانا ایجاد کرنا کیا سنت ہے؟ یہ ایک صریح بدعت ہے۔ یہ رسول اللہ کی سنت نہیں بلکہ مہارانی جودھابائی کی سنت ہے۔ اکبر اعظم کے خوف سے اس وقت درباری علما کے پاس ایسی رسموں کا جواز پیدا کر کے دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا، لیکن بدقسمتی سے بعد کے علما میں اجتہاد کا شعور نہیں رہا اور یہی روش جڑ پکڑ گئی، اور آج راجبوتوں کی ہر رسم کو اسلامی جواز فراہم کیا جا رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اِس دور میں جن کے پاس حرام حلال کی پروا کئے بغیر لاکھوں کی کمائی ہے وہ تو کئی کئی لاکھ کا کھانا کھلا سکتے ہیں، لیکن ایسے مستی خورے سماج میں دس پندرہ فیصد سے زیادہ نہیں۔ لیکن ان کی وجہ سے جو شان اور دکھاوے کا ماڈل بن چکا ہے، ''لوگ کیا کہیں گے'' کے خوف سے اکثریت کے لئے نکاح کے دن کھانا کھلانا بچی کی سسرال میں عزت کا سوال بن جاتا ہے۔ اس لئے جن لڑکیوں کے باپ قرض لے کر یا گھر بیچ کر یا بیٹوں کو کنگال کر کے خرچ کر سکتے ہیں ان کی شادیاں تو ہو جاتی ہیں۔ لیکن جن لڑکیوں کے باپ یہ نہیں کر سکتے وہ لڑکیاں سوائے انتظار میں بال سفید کرنے یا غلط راستوں پر جانے کے اور کیا کر سکتی ہیں؟

سنا ہے کہ جب بنگال میں تاریخ کا بدترین قحط پڑا تھا، ملکہ برطانیہ نے معصومیت سے کہا تھا کہ روٹی نہیں ملتی تو لوگ کیک کیوں نہیں کھاتے؟ اسی طرح حضرت معترض کی طرح کئی معصوم ایسے ہیں جن کو زمینی حقائق کا علم ہی نہیں، آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ جس کی استطاعت ہے وہ خرچ کرے، ورنہ وہ سادگی سے شادی کرے۔ مطلب یہ ہوا کہ

رسول اللہ ﷺ یا علیؓ کی استطاعت نہیں تھی، وہ نہیں کر سکے، لیکن جس کی استطاعت وہ ضرور کرے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کلچر الگ تھا، مطلب یہ کہ اب ہم رسول اللہ کے قدامت پسند کلچر پر نہیں چل سکتے اگر ہم مہارانی جودھا بائی کے کلچر پر نہیں چل سکے تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔

ولیمہ اگلے دن کرنے کی منطق جو ہمارے مولویوں نے بیان کی ہے وہ ہے شبِ زفاف کی۔ ہمارے مولویوں نے بھی ولیمہ کی اصل علت کو بازو ہٹا کر دلہا دلہن کی ملاقات اور۔۔۔۔۔۔ کی شرطیں رکھ دیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا دلہا شبِ زفاف کی تکمیل کا کوئی سرٹیفکٹ پیش کرتا ہے جس کے بعد ہی ولیمہ جائز ہوتا ہے؟ آپ کو اڈوانس میں ولیمہ کا رقعہ لیتے ہوئے کیسے یقین ہے کہ شبِ زفاف کامیاب ہوگی؟ کیا آپ نے اگلے دن ولیمہ کرنے والوں سے دعوت نامہ قبول کرنے سے پہلے کبھی کوئی ضمانت لی ہے کہ شبِ زفاف کامیاب ہوگی؟ کیا شریعت میں ایسی کوئی شرط ہے کہ شبِ زفاف کا ثبوت ہو تو ولیمہ کھانا جائز ہے ورنہ نہیں؟ بھائی، ولیمہ میں کسی ثبوت وبوت، یقین وقین کی بات نہیں ہوتی، صرف اچھے گمان اور امید کی بنیاد پر ہی لوگ آتے ہیں اور کھا کر چلے جاتے ہیں۔ سب کو گمان یا امید ہوتی ہے کہ شبِ زفاف ضرور ہوگی۔ جب آپ کئی دن پہلے سے یہ گمان یا امید رکھتے ہیں کہ شبِ زفاف ضرور ہوگی تو یہی گمان آپ ولیمہ کو سیم ٹائم یعنی نکاح کے وقت ہی کر کے اسی گمان یا امید کی بنا پر کھا سکتے ہیں۔

چونکہ معترض حضرت سوشیو ریفارمس سوسائٹی سے واقف ہی نہیں، نہ انہوں نے مضمون لکھنے سے پہلے کسی ذمہ دار سے اس کی کارکردگی کے بارے میں معلومات حاصل کیں، نہ کبھی اِس کی یوٹیوب، ویب سائٹ، فیس بک دیکھی، نہ ہماری وہ کتابیں پڑھیں جن کی مستند علما نے اپنے مقدمہ کے ذریعہ تصدیق کی۔ اور نہ اِس اہم موضوع پر کسی مستند عالم سے کوئی رہنمائی حاصل کی۔ اور کہہ دیا کہ ان کی شادی سے لے کر دادا ونانا بن جانے تک چونکہ ایک ہی وقت میں نکاح اور ولیمہ انہوں نے کبھی نہیں دیکھا، لہذا اسی کو دلیل بنا کر ہمیں شدت پسند، بے وزن اور بے جان کہہ کر بریانی، بگھارے بیگن اور شاہی ٹکڑوں کے بھوکوں کو یہ کہہ کر خوش کر دیا کہ ڈٹ کر کھاؤ سب جائز ہے۔ اور یہاں تک جسارت کے ساتھ یہ کہہ ڈالا کہ یہ کوئی حرام حلال کا مسئلہ نہیں ہے۔ کم سے کم یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ لکھتے ہوئے آدمی کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ حلال وحرام کے بل میں بغیر تحقیق کے صرف اپنے عقلی گھوڑے دوڑانا غلط بلکہ گمراہ کن رویہ ہے۔ یہ حلال و حرام کا مسئلہ ہے یا نہیں یہ جاننے کے لئے کئی علمائے حق ابھی زندہ ہیں، جن کی تحریریں ہماری کتابوں میں نقل ہیں، جن کے ویڈیوز ہماری چینلس پر موجود ہیں۔ پہلے علمی طور پر لیس ہوئیے پھر حلال وحرام کے موضوع پر قلم اٹھائیے۔

تحریر: ڈاکٹر بی آر امبیڈکر۔ انگریزی سے ترجمہ: **احمد نور عینی**۔ ریسرچ اسکالر: جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

(ہندو سماج کی ذات پات اور غیر ہندو سماج کی ذات پات میں فرق)

ایک جماعت ایسی ہے جسے ہندوؤں کے ذات پات والے نظام میں کوئی نفرت اور تعجب خیز بات نظر نہیں آتی، یہ لوگ مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے معاملے کو بہ طور مثال پیش کرتے ہیں اور اس حقیقت کو پا کر کہ ان میں بھی ذاتیں ہیں تشفی بخش سکون محسوس کرتے ہیں، اس پر غور کرتے وقت ابتدا ہی میں یہ بات اپنے میں ذہن میں رکھنی ہوگی کہ انسانی سماج کہیں بھی ایک تنہا اور غیر منقسم اکائی کی شکل میں اپنا وجود نہیں رکھتا، انسانی سماج ہمیشہ مختلف اکائیوں کا مجموعہ ہوتا ہے، عمل کی دنیا میں فرد ایک انتہا پر ہے اور سماج دوسری انتہا پر، ان دونوں انتہاؤں کے بیچ مختلف اشتراکی واجتماعی سرگرمیوں کی چھوٹی بڑی اکائیاں ہیں، مثلاً: خاندان، حلقۂ احباب، مشترکہ تعاون پر مبنی تنظیمیں، تجارتی کمپنیاں، سیاسی پارٹیاں، چوروں اور لٹیروں کی ٹولیاں وغیرہ۔ یہ چھوٹی اکائیاں اپنے افراد کو آپس میں مضبوطی کے ساتھ جوڑے ہوئے ہوتی ہیں، اور اکثر دخول غیر سے اس طرح مانع ہوتی ہیں کہ گویا یہ الگ الگ اکائیاں اپنے آپ میں الگ الگ ذاتیں ہوں، ان کا ایک تنگ اور سخت ضابطۂ عمل ہوتا ہے جو اکثر وبیشتر سماج مخالف ہوتا ہے، یہ ہر سماج کی سچائی ہے، چاہے یورپ ہو یا ایشیا۔ کوئی بھی سماج مثالی سماج ہے یا نہیں یہ طے کرنے کے لیے جو سوال ہونا چاہیے وہ یہ نہیں کہ آیا اس سماج میں مختلف اکائیاں پائی جاتی ہیں یا نہیں؛ کیوں کہ مختلف اکائیوں سے کوئی بھی سماج خالی نہیں ہوتا، کونسا سماج مثالی سماج ہے یہ طے کرنے کے لیے جو سوالات پوچھے جانے چاہئیں وہ یہ ہیں: ان مفادات کی تعداد کتنی زیادہ اور کس قدر متنوع ہے جو سماج کی تمام اکائیوں کے درمیان شعوری طور پر مشترک ہیں؟ سماج کی اکائیوں کا باہمی تعامل کس قدر بھرپور اور آزادانہ ہے؟ اکائیوں کو تقسیم کرنے والے اسباب ومحرکات زیادہ ہیں یا انھیں متحد کرنے والے؟ اس اجتماعی زندگی کی سماجی اہمیت کیا ہے؟ ہر اکائی کی اجتماعی زندگی کا داخلی انحصار اور دوسری اکائیوں سے گریز پائی رسم رواج کی وجہ سے ہے یا سہولت کی وجہ سے یا پھر مذہب کی وجہ سے؟ ان سوالات کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا جانا چاہیے کہ غیر ہندوؤں میں رائج ذات ہندوؤں میں رائج ذات کی طرح ہے یا دونوں میں فرق ہے۔ اگر ہم ایک طرف مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں کے درمیان رائج ذاتوں کو رکھیں اور دوسری طرف ہندوؤں کے درمیان رائج ذاتوں کو رکھیں اور پھر ان سوالات کی روشنی میں غور کریں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ غیر ہندوؤں میں رائج ذات پات اور ہندوؤں میں رائج ذات پات کے بیچ کئی بنیادی فرق ہیں:

☆ پہلا فرق یہ ہے کہ ہندوؤں کے درمیان ایسی مشترکہ بنیادیں ناپید ہیں جو تمام ہندوؤں کو متحد رکھ سکیں، جب کہ غیر ہندوؤں میں ایسی کئی مشترکہ بنیادیں ہیں جو انھیں متحد رکھتی ہیں، کسی سماج کی توانائی اس سماج میں موجود مختلف اکائیوں کے درمیان پائے جانے والے باہمی تعامل کے امکانات اور نقطہ ہائے ارتباط کے وجود پر منحصر ہے، کارلائل Carlyle کے الفاظ میں آپ انھیں

Organic Filaments (نامیاتی ریشے) کا نام دے سکتے ہیں، یعنی وہ لچک پذیر ریشے جو منتشر عناصر کو ملا کر دوبارہ یکجا کرنے میں مددگار ہوتے ہیں، ذات پات نے ہندو سماج کے جو تار و پود بکھیرے ہیں ان کی شیرازی بندی کے لیے ہندوؤں کے پاس کوئی متحدہ قوت نہیں ہے، جب کہ غیر ہندوؤں میں ایسے نامیاتی ریشوں کی کوئی کمی نہیں ہے جو انھیں متحد رکھتے ہیں، لہذا یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے کہ گو غیر ہندوؤں میں بھی ہندوؤں کی طرح ذات پات رائج ہے؛ مگر ہندوؤں کے یہاں ذات پات کو جو سماجی حیثیت واہمیت حاصل ہے وہ غیر ہندوؤں کے یہاں ناپید ہے۔ کسی مسلمان یا سکھ سے اگر آپ یہ سوال کریں کہ آپ کون ہیں؟ تو وہ جواب میں کہے گا کہ میں مسلمان ہوں یا سکھ ہوں، وہ کسی نہ کسی ذات سے تعلق رکھتا ہوگا؛ مگر جواب میں وہ اپنی ذات نہیں بتائے گا، اور آپ کو اس کے محض اتنے سے جواب سے تشفی بھی ہو جائے گی۔ جب وہ آپ سے کہے گا کہ میں مسلم ہوں تو آپ اس سے مزید یہ نہیں پوچھیں گے کہ آپ شیعہ ہیں یا سنی، شیخ ہیں یا سید، کھٹک ہیں یا پنجاری۔ اسی طرح جواب دینے والا جب آپ سے کہے گا کہ میں سکھ ہوں تو آپ اس سے یہ نہیں پوچھیں گے کہ آپ جاٹ ہیں یا روڈا، مذبی ہیں یا رام داسی۔ اس کے برخلاف اگر آپ کے سوال کے جواب میں کوئی کہے کہ میں ہندو ہوں تو آپ اس کے محض اتنے سے جواب پر مطمئن نہیں ہوں گے؛ بل کہ آپ کو اس کی ذات پوچھنے کی بھی ضرورت محسوس ہوگی۔ کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ذات پات ہندوؤں میں ایک ایسی لازمی شی ہے جسے جانے بغیر آپ کو یقین ہی نہیں ہوگا کہ سامنے والا کس طرح کا آدمی ہے۔

☆ ہندوؤں کے یہاں ذات کی اصول شکنی کا جو نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے اس کو سامنے رکھنے سے بھی یہ بات بے غبار ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں کے درمیان ذات کو جو سماجی حیثیت واہمیت حاصل ہے وہ غیر ہندوؤں کے یہاں نہیں پائی جاتی، سکھوں اور مسلمانوں کے یہاں ذات پات کا ہونا بعید نہیں ہے؛ مگر سکھوں اور مسلمانوں کے یہاں ذات کی اصول شکنی کے پاداش میں ذات سے باہر کا راستہ نہیں دکھایا جاتا، ذات سے اخراج کی سوچ یقیناً سکھوں اور مسلمانوں کے لیے اجنبی اور نامانوس سوچ ہے؛ مگر ہندوؤں کا معاملہ یکسر مختلف ہے، ہندوؤں کے یہاں اگر کوئی ذات کے اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے تو ذات سے اس کا اخراج یقینی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں اور غیر ہندوؤں کے درمیان ذات کی سماجی حیثیت میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ دوسرا فرق تھا۔

☆ ایک تیسرا فرق بھی ہے جو زیادہ اہم ہے، غیر ہندوؤں کے یہاں ذات کو کسی طرح کا مذہبی تقدس حاصل نہیں ہے، جب کہ ہندوؤں کے یہاں اسے مکمل مذہبی تقدس حاصل ہے، غیر ہندوؤں کے یہاں ذات محض ایک عمل ہے نہ کہ مقدس رسم، ذات پات کا انھوں نے آغاز نہیں کیا، پہلے سے چلی آرہی رسم ان کے ساتھ باقی رہ گئی، یہ لوگ ذات کو مذہبی اصول کے طور پر نہیں مانتے، مذہب ہندوؤں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ذاتوں کو آپس میں جدا کرنے اور ایک کو دوسرے سے الگ تھلگ رکھنے کو فضیلت کا عمل سمجھیں، مذہب غیر ہندوؤں کو ذات کے تئیں اس طرح کا رویہ اپنانے پر مجبور نہیں کرتا، ہندوؤں کے یہاں اگر کوئی ذات کو توڑنا چاہے تو مذہب آڑے آجاتا ہے، جب کہ غیر ہندوؤں کے یہاں ایسا کچھ نہیں ہے، جو لوگ یہ جاننے کی پروا نہیں کرتے کہ آیا غیر ہندوؤں میں ذات پات کی کیا جگہ ہے، اور آیا ان کے

درمیان ایسینا میاتی ریشے پائے جاتے ہیں جو سماج کے احساسات وجذبات کو ذات کے احساسات وجذبات پر غالب رکھتے ہیں،اور یہ جانے بغیر غیر ہندوؤں میں ذات پات کو محض موجود پاکر تشفی بخش سکون محسوس کرتے ہیں وہ خطرناک فریب کا شکار ہیں، ہندو اس دام فریب سے جتنا جلد باہر نکل آئیں اتنا بہتر ہے۔

ایک گروہ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ذات پات سے ہندوؤں کے لیے کسی بھی طرح کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے، لہذا اس کے نزدیک یہ کوئی غور طلب قضیہ نہیں ہے، ایسے ہندو اس ناحیہ سے اپنی تسکین کا سامان تلاش کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی آبادی (ذات پات کے اس رواج کے ساتھ، تاریخ کے قدیم زمانے سے لے کر اب تک ہر دور میں) باقی رہی ہے، یہ لوگ اس سے یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ (ہندوؤں کی آبادی ذات پات کے اس نظام کے ساتھ) باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے، پروفیسر رادھا کرشنن نے اپنی کتاب میں اس نقطہ نظر کو اور کھول کر بیان کیا ہے، ہندوازم کے حوالے سے وہ کہتے ہیں:

''خود اس تمدن نے کافی طویل حیات پائی ہے، اس کے تاریخی ریکارڈ چار ہزار سال پرانے ہیں، تب بھی یہ تمدن کے اس مقام کو حاصل کر چکی تھی کہ آج تک اس کا سفر بغیر انقطاع کے جاری ہے، اس سفر کی رفتار آہستگی یا توقف سے آشنا تو رہی؛ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس تمدن کا سفر انقطاع کا شکار ہو گیا ہو، اس نے زائد از چار ہزار سالوں پر محیط روحانی افکار و تجربات کے دباؤ اور تناؤ کا تحمل کیا ہے، گو کہ تاریخ کے ابتدائی دور سے ہی مختلف نسلوں اور تہذیبوں کے لوگ بھارت آکر بستے رہے، مگر ہندو مت ہمیشہ اپنی بالادستی قائم رکھنے پر قادر رہا، حتی کہ سیاسی اقتدار کے حامل تبلیغی مذاہب بھی ہندوؤں کی اکثریت کو اپنے عقائد وافکار قبول کرنے پر مجبور نہ کر سکے۔ ہندو تہذیب ایسی حیات بخش توانائی کی حامل ہے جس سے بہ ظاہر کئی دیگر مزید طاقتور دھارائیں بھی محروم ہیں، جس طرح یہ جاننے کے لیے کہ درخت کے اندر ابھی بھی رس رواں دواں ہے یا نہیں، درخت کو چیرنا غیر ضروری ہے، اسی طرح بل کہ اس سے کہیں زیادہ غیر ضروری ہے کہ ہندو دھرم کو سمجھنے کے لیے اس کا جسم چاک کیا جائے''۔

پروفیسر رادھا کرشنن ایک ایسا بڑا نام ہے کہ وہ چاہے جو کہیں ان کی باتیں گہرائی والی ہوتی ہیں اور قارئین کے دماغوں کو متاثر کرتی ہیں؛ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے میں کوئی تذبذب نہیں ہونا چاہیے؛ کیوں کہ مجھے خدشہ ہے کہ پرفیسر صاحب کا یہ بیان اس خطرناک دلیل کی بنیاد نہ بن جائے کہ ہندوؤں کا اب تک باقی رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ باقی رہنے کے قابل ہیں، میرے خیال میں یہ سوال ہی غلط ہے کہ آیا کوئی سماج باقی رہتا ہے یا فنا ہو جاتا ہے؛ سوال یہ ہونا چاہیے کہ باقی رہنے والا سماج کس حالت میں زندہ رہتا ہے؟ زندہ رہنے کی کئی شکلیں ہیں؛ مگر ہر طرز حیات کو عزت کی زندگی نہیں کہا جا سکتا، فرد ہو یا سماج دونوں کے لیے محض زندہ رہنے اور قابل قدر زندگی گذارنے کے درمیان کافی فرق ہے، میدان جنگ میں داد شجاعت دے کر باوقار زندگی گذارنا ایک طرز حیات ہے، اور میدان چھوڑ کر بھاگنا، ہتھیار ڈالنا اور اسیری کی زندگی گذارنا بھی ایک طرز حیات ہے۔ لہذا کوئی ہندو اگر یہ سوچ کر تسلی حاصل کرتا ہے کہ وہ اور اس کے لوگ اب تک فنا نا آشنا ہیں تو یہ ایک فضول کی تسلی ہے، اسے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اس بقا کا معیار کیا رہا

رہبر پرتاپ گڑھی، اُتر پردیش

غزل

نہ لی خبر نہ کوئی بھیجا ہے پیام کبھی
رہی ہے جن سے مسلسل دعا سلام کبھی

ضرور حال دل غم زدہ سنا دینا
جو آئے سامنے ان کے ہمارا نام کبھی

ہر ایک پھول میں خوش بو ہماری ہے شامل
چلا تھا ہم سے گلستان کا نظام کبھی

زبان اپنی سدا رکھنا اپنے قابو میں
بڑوں کے سامنے ہونا نہ بے لگام کبھی

طلب ہمی سے ثبوت وفا بھلا کب تک؟
میں ان سے پوچھوں گا ہو کر کے ہم کلام کبھی

رضائے حق سے جو کرتے ہیں انحراف سدا
میاں! وہ ہو نہیں سکتے ہیں شادکام کبھی

نہ جانے دوست وہ میرے کہاں ہیں اے رہبر!
جو ساتھ سائے کی صورت تھے صبح و شام کبھی

نورالدین نور غوری

غزل

ہوگئے لوگ ادھ مرے جیسے
ان کے قائد بھی بلبلے جیسے

کوئی تو بات ہے کہ اب مجھ کو
شہر لگتے ہیں مقبرے جیسے

آج ہم شہریوں کے ہاتھوں میں
کچھ کھلونے ہیں جھنجھونے جیسے

سب نے مل جل کے تنگ گلیوں میں
کھود رکھے ہیں کچھ گھڑھے جیسے

مسندیں ساری مرتبے سارے
بے ضمیروں کے واسطے جیسے

منہ میں اک دانت بھی نہیں لیکن
دانے مٹھی میں ہیں چنے جیسے

نورؔ آثار ہیں قیامت کے
شیر بھی ہوگئے گدھے جیسے

ہے، اگر وہ اس پہلو سے غور کرے گا تو مجھے یقین ہے کہ وہ بقا والی بات پر فخر کرنا چھوڑ دے گا، ایک ہندو کی زندگی مسلسل شکست وہزیمت سے عبارت رہی ہے، ہندوؤں کو جو یہ لگتا ہے کہ ان کی زندگی پیہم دواں وہر دم جواں رہی ہے تو یہ ایک غلط فہمی ہے، ان کی زندگی تو پیہم ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہی ہے، یہ ایک ایسا طرز حیات ہے جس پر صحیح ذہنیت رکھنے والے اور حق کا اعتراف کرنے والے ہندوؤں کو شرم محسوس ہوتی ہے۔

''حرف واثر'' اور بیان شبلی: ایک مطالعہ

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

مبصر: **اسامہ ارشاد معروفی قاسمی**۔ پورہ معروف کرتھی جعفر پور ضلع مئو، یوپی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود جس طرح سے ایک کے بعد ایک کتابیں پیش کر رہے ہیں، ایک منظر عام پر آتی ہے تو دوسری پریس میں جانے کو تیار رہتی ہے۔ یہ واقعی حیران کن بھی ہے اور قابل رشک بھی، لیکن یہ سب کچھ اس لیے بھی ہو رہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے اور ان کے خلوص کی برکت بھی ہے۔ موصوف اس قدر شبلی پر کام کر چکے ہیں کہ اب دونوں نام (الیاس و شبلی) لازم و ملزوم بن چکے ہیں اور مزید ابھی شبلی پر کتابوں کا سلسلہ جاری ہی ہے؛ لیکن ڈاکٹر صاحب شبلیات کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھتے رہے ہیں، ان کے علمی و تحقیقی، تنقیدی و تاریخی مضامین کے اب تک سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں میں ایک مجموعہ ''حرف واثر'' بھی ہے جو ابھی چند ماہ قبل شائع ہوا ہے اور اس وقت میرے مطالعہ میں ہے اور اس سے تقریباً ڈیڑھ سال قبل ۲۰۲۱ء میں ان کے مضامین کا مجموعہ ''قدر اور سائے'' بھی میرے مطالعہ میں آیا تھا اور اس پر راقم نے تبصرہ بھی کیا تھا۔ اب دونوں مجموعوں کے مطالعہ کے بعد ایک بات تو بالکل واضح ہو چکی ہے اور مجھے اس کا بخوبی اندازہ بھی ہوا ہے کہ یہ مضامین کے مجموعے علمیت و ادبیت اور تحقیقات میں کسی بھی لحاظ سے سلسلۂ شبلیات کی کتب سے کم نہیں ہیں۔ ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی دونوں ہی جہتیں بہت ہی روشن اور بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

''حرف واثر'' میں کل ۲۵ر علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں، جن میں چند ایک کو چھوڑ کر سبھی مضامین اردو ادب کے نامور ادیب و نقاد، شاعر اور محققین و مصنفین اور ان کی کاوشوں کے ذکر پر مشتمل ہیں۔ کتاب کے آغاز میں ۴ر صفحات پر مشتمل مصنف کا ''دیباچہ'' بھی شامل ہے۔ پہلا مضمون ''سرسید اور اعظم گڑھ'' کے عنوان سے ہے، جس میں سرسید احمد خاں کے اعظم گڑھ سے تعلقات کے ساتھ ان کی ایک نادر تقریر کو بھی شامل کیا گیا ہے جو انھوں نے اعظم گڑھ میں امرا و روسا اور ملت کے بہی خواہوں کے سامنے ۱۸۷۴ء میں کی تھی اور انھیں ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام کی طرف متوجہ کیا تھا۔ کتاب میں جن اہم شخصیات کی گراں قدر علمی و ادبی اور تاریخی خدمات اور ان کے کارناموں پر مشتمل مضامین شامل ہیں، ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال، مولانا عبدالسلام ندوی، اقبال احمد خاں سہیل، محبوب الرحمٰن کلیم، شاہ افضال اللہ قادری، حافظ ڈاکٹر محمد مرسی، ڈاکٹر آدم شیخ، محمد حامد سراج، ڈاکٹر ابرار اعظمی، ڈاکٹر مختار شمیم، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، انوار اعظمی، پروفیسر احمد سعید، محمد فاروق

اعظمی، ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی اور نامور نقاد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جو مضامین ہیں ان میں ایک اعظم گڑھ اور اس کے قصبات کے گمنام شعرا کے ذکر اور ان کے کلام پر مشتمل ہے۔ دوسرے مضمون میں ''اعظم گڑھ میں اردو صحافت اور قدیم مطابع کا عمدہ جائزہ لیا گیا ہے، اسی طرح دو اور اہم مضمون، ایک میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کا رسالہ ''معارف کی ادبی خدمات'' کا تحقیقی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اور دوسرا مضمون ''اسلامیات کے چند اہم اردو رسائل و جرائد کے اشاریے'' پر مشتمل ہے جو بڑی عرق ریزی اور تحقیق سے لکھا گیا ہے۔ کتاب کے آخری حصہ میں ضمیمہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب زندگی کا ایک اہم باب ''میری علمی و مطالعاتی زندگی'' کے عنوان سے شامل کیا ہے، جس میں موصوف نے اپنے خاندانی و تعلیمی پس منظر کے ساتھ ساتھ اپنی مطالعاتی زندگی کے تجربات اور نچوڑ کو بھی بڑی سنجیدگی اور پراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ نیز مطالعہ کا طریقہ اور اصول بھی بتایا ہے۔ یقیناً اس کا مطالعہ طلبہ اور نئے لکھنے والوں کے لیے نہایت مفید ثابت ہوگا۔ آخر میں کتاب کے حوالے سے مصنف کی چند سطریں پیش کر رہا ہوں جو انھوں نے ''دیباچہ'' کے آخر میں لکھی ہیں۔

> ''حرف واثر کے سلسلہ میں ناچیز کو کسی قسم کا دعویٰ نہیں۔ البتہ یقین ضرور ہے کہ اس کے مطالعہ سے قارئین کے علم اور معلومات میں مفید اضافہ ضرور ہوگا، اس لئے کہ اس میں متعدد ایسے علمی و تحقیقی مضامین شامل ہیں جو میرے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل ہیں۔'' (صفحہ ۱۰)

کتاب ۲۶۴ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اشاعت ۲۰۲۲ء۔ ناشر: ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔ مطبع: اصیلہ پرنٹرس دہلی۔ ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ جامع مسجد دہلی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ اور مکتبہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ یوپی ہیں۔

☆☆☆

زیر تعارف کتاب ''بیان شبلی (۱)'' علامہ شبلی نعمانیؒ کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر مشتمل ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو ''متعلقات شبلی''، ''شبلی اور جہان شبلی'' اور ''نقوش شبلی'' ان مجموعوں کی اشاعت کے بعد بھی مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے؛ کیونکہ مذکورہ تینوں مجموعوں کی اشاعت بعد ڈاکٹر صاحب نے یہ فیصلہ کیا کہ اب بقیہ مقالات کے مجموعوں کو مختلف ناموں کے بجائے صرف ''بیان شبلی'' کے نام سے سلسلہ وار شائع کیا جائے اور پیش نظر مجموعہ ''بیان شبلی'' اسی سلسلہ کا پہلا حصہ ہے، جس کی اشاعت ۲۰۲۱ء میں ہوئی ہے۔ صفحات ۲۰۸ر ہیں اور انتساب ڈاکٹر سلمان سلطان کے نام کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں کل گیارہ مضامین و مقالات شامل ہیں اور سبھی مقالات شبلی نعمانیؒ کی شخصیت کے کسی نئے پہلو اور نئے گوشے کو سامنے لاتے ہیں۔ مزید ان میں متعدد اور متنوع جدید تحقیقات بھی شامل ہیں۔

''بیان شبلی (۱)'' میں پہلا مقالہ ''تصوف: علامہ شبلی کی ایک نادر تقریر'' کے عنوان سے ہے، اس میں علامہ شبلی کا تصوف کے موضوع پر ایک نادر خطبہ ہے جو انھوں نے خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر دہلی میں ان کے حلقۂ مشائخ میں دیا تھا، یہ خطبہ اس لحاظ سے بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے

کہ یہ تصوف کے موضوع پر علامہ شبلی کا واحد خطبہ ہے۔ دوسرا مقالہ ''علامہ شبلی کے نام معاصرین کے خطوط مسائل و مباحث'' پر مشتمل ہے، اس میں معاصرین کے کل ۷۲/خطوط یا خطوط کے اہم اقتباسات شامل ہیں اور یہ سب وہ خطوط ہیں جو ''مکتوبات شبلی'' اور ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' کی اشاعت کے بعد مزید دستیاب ہوئے ہیں، اس مقالہ میں خطوط کے تعارف و تجزیہ کے ساتھ ساتھ شبلی کے بعض اہم کارنامے مثلاً ''انجمن ترقی اردو، وقف علی الاولاد، ندوۃ العلماء، ان کی کتاب ''الانتقاد'' اور بعض دوسرے ضمنی موضوعات بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ تیسرا مقالہ ''علامہ شبلی، اقبال اور دارالمصنفین'' ہے، اس میں علامہ اقبال کے ساتھ علامہ شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اور ''معارف'' سے دیرینہ تعلقات اور علمی روابط کی تفصیل قلم بند کی گئی ہے۔ علامہ اقبال دارالمصنفین کی انتظامیہ کے مدۃ العمر رکن بھی رہے اور ''معارف'' سے بھی بے پناہ دلچسپی لی۔ چوتھا مقالہ ''شبلی کے چند نو دریافت غیر مدون خطوط'' ہے اس میں علامہ شبلی کے مزید تیرہ نو دریافت خطوط کو شامل کیا گیا ہے، جن کے مکتوب الیہ بھی نئے اشخاص ہیں۔ اس لیے خطوط شبلیات میں یہ اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں، ان میں ۹/خطوط بہت ہی مختصر ہیں؛ لیکن پھر بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ پانچواں مقالہ ''سیاسیات شبلی'' ہے، اس میں علامہ شبلی کے سیاسی نظریات اور ان کے اصل حقائق کو پیش کیا گیا ہے۔ چھٹا مقالہ ''شبلی کے چند منتخب اشعار'' میں شبلی کے اردو و فارسی اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ ساتواں مقالہ ''کلام شبلی پر تضمین: ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ہے، اس میں کلام شبلی پر جو تضمین فارسی اور اردو کے شعرا نے کی ہے اس کا تعارف و تجزیہ پیش کیا گیا ہے اور یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ تضمین کی اہمیت کے ساتھ اس کا پس منظر بھی بیان کر دیا جائے۔ آٹھواں مقالہ ''اردو شارٹ ہینڈ اور علامہ شبلی'' ہے اس میں اردو شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) کے فن اور اہمیت کے موضوع پر علامہ شبلی کی ایک تقریر کا اقتباس شامل کیا گیا ہے۔ شبلی نے یہ تقریر کرسچین کالج کے جلسہ میں کی تھی، مرزا ہادی رسوا کی خواہش پر علامہ اس میں شریک ہوئے تھے۔ مرزا ہادی رسوا نے ۱۹۱۰ء میں ''رسالہ اردو شارٹ ہینڈ'' کے نام سے ایک کتاب بھی شائع کی تھی۔ نواں مقالہ ''بیان شبلی'' کے نام سے ہے، جس میں علامہ شبلی، ان کی فکر و نظر، تصنیفات و تالیفات اور مختلف زبانوں میں ان کے تراجم وغیرہ سے متعلق نئی معلومات جمع کی گئی ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نہایت دلچسپ مقالہ ہے۔ دسواں مقالہ ''شبلی کی بدولت: دارالمصنفین'' ہے، اس میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا تعارف اور اس کے عظیم الشان علمی و تحقیقی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ آخری گیارہواں مقالہ ''علامہ شبلی کا ایک خواب: معارف'' کے عنوان سے ہے اس میں ماہنامہ ''معارف'' کی اجمالی تاریخ اور بے مثال علمی و ادبی خدمات کا انتہائی جامع مرقع پیش کیا گیا ہے۔ آخر میں مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی کے قلم سے کتاب کا اشاریہ بھی شامل ہے۔ کتاب کی مجموعی حیثیت کے حوالے سے مصنف کی چند سطریں بھی ''دیباچہ'' سے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

> ''بحیثیت مجموعی ''بیان شبلی'' میں علامہ شبلی نعمانی کی سیرت و سوانح، شخصیت، عظمت اور ان کے لازوال متنوع اور گونا گوں کارناموں کے ساتھ متعدد نئے

پہلوؤں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اس سے خاص طور پر نو دریافت اطراف و جہات شبلی کی وسعت، ہمہ گیری اور اہمیت کے متنوع پہلو نگاہوں میں آتے ہیں۔ یقین ہے فکر شبلی کی تفہیم و ترسیل میں یہ مجموعہ نہ صرف معاون اور مفید ثابت ہوگا بلکہ ذخیرۂ شبلیات میں بھی ایک اضافہ قرار پائے گا"۔ (صفحہ ۱۴)

کتاب ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔ قیمت: ۳۰۰/روپئے ہے، اس کو مکتبہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور مکتبہ جامعہ اردو بازار جامع مسجد دہلی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

ماہ رمضان اللہ کی عظیم نعمت ہے، مومن نعمتوں کی قدر کرتا ہے

بزم سرور کونین کے زیر اہتمام بمقام کامل ہال احاطہ مسامیہ نونہال ہائی اسکول یاقوت پورحیدرآباد میں جلسہ فضائل ماہ رمضان، نعتیہ مشاعرہ اور تہنیتی تقریب کا انعقاد کیا گیا، جلسہ کی صدارت صدر سراج العلماء اکیڈمی مولانا نعیم الدین حسامی عادل نے کی، نعتیہ مشاعرہ کی نگرانی شیخ اسماعیل صابر نے کی، صدر بزم ڈاکٹر ناقد رزاقی نے خیر مقدمی تقریر کی، اس میں انہوں نے مولانا فصیح الدین نظامی کی حالیہ اہم تصنیف جو ۱۵۰ رسالہ جامعہ نظامیہ کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے تین جلدوں پر مشتمل ہے اسے اس صدی کا عظیم کارنامہ قرار دیا ہے جس سے ان کی علمی صلاحیتوں اور جامعہ نظامیہ کی حجیت کا بین ثبوت ملتا ہے۔ اسی بنا پر آج اس اہم اجلاس میں بزم سرور کونین کی جانب سے ان کی تہنیت کی جارہی ہے۔

صدر اجلاس مولانا نعیم الدین حسامی عادل صاحب نے رمضان کی قدر و قیمت پر پر مغز روشنی ڈالی، مہمان خصوصی کی حیثیت سے مولانا مفتی ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد نے شرکت کی، انہوں نے اپنے خطاب میں قرآن کی عظمت پر روشنی ڈالی اور مولانا فصیح الدین نظامی کے علمی کاوش کو تامت وقیع قرار دیا۔ معتمد سراج العلماء اکیڈمی مولانا زعیم الدین حسامی صاحب نے ماہ رمضان میں خوب عبادتیں کرنے پر زور دیا اور رشتہ داروں کی خاص مدد کرنے کی تلقین کی۔ صدر جلسہ مولانا محمد نعیم الدین حسامی عادل صاحب کے دست مبارک سے مولانا شاہ محمد فصیح الدین نظامی کی گل پوشی، شال پوشی کی گئی اور یادگار مومنٹو پیش کیا گیا۔ مولانا شاہ محمد فصیح الدین نظامی صاحب نے بزم سرور کونین کے روح رواں، طالب رزاقی مرحوم کے فرزندان ڈاکٹر ناقد رزاقی اور تشکیل انور رزاقی کے حق میں دنیا و آخرت کی کامیابی کے لئے دعا کی، اور اللہ رب العزت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بزم سرور کونین کا بھی شکریہ ادا کیا۔

نعتیہ مشاعرہ میں شیخ اسماعیل صابر، ڈاکٹر ناقد رزاقی جناب سید نوید جعفری، تشکیل انور رزاقی، مولانا زعیم الدین حسامی، محمد ثناء اللہ انصاری وصفی، سید سہیل عظیم جلیس بھارتی نے عمدہ کلام پیش کیا، تشکیل انور رزاقی نے حاضرین محفل کا شکریہ ادا کیا۔

مشہور عالم دین، مفسر قرآن مولانا غیاث الدین احمد رشادی کو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کی جانب سے مبارک باد پیش کی جاتی ہے۔ مولانا رشادی نے دروس کی شکل میں عام فہم درسِ قرآن کے نام سے چھ جلدوں میں جو تفسیر لکھی ہے انفرادی حیثیت کی حامل ہے۔ نیز انہوں جو انہوں نے اس تفسیر سے استفادہ کا موقع ائمہ وعلماء کو دیا ہے وہ قابل تحسین وتقلید ہے۔ امید قوی ہے کہ ان شاء اللہ یہ تفسیر ملت وملک کے لئے مفید ثابت ہوگی۔

تصویر میں شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے چیئرمین وایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد و مولانا محامد ہلال اعظمی صدر صفابیت المال انڈیا بانی ومحرک منبرء محراب فاؤنڈیشن انڈیا، مولانا غیاث الدین احمد رشادی کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning: 9:00 am to 2:00 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیرٹیبل ٹرسٹ، حیدرآباد

SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL & CHARITABLE TRUST

Regd. No. 180/2016

مسجدِ الٰہی کی تعمیر کے لئے تعاون کی اپیل

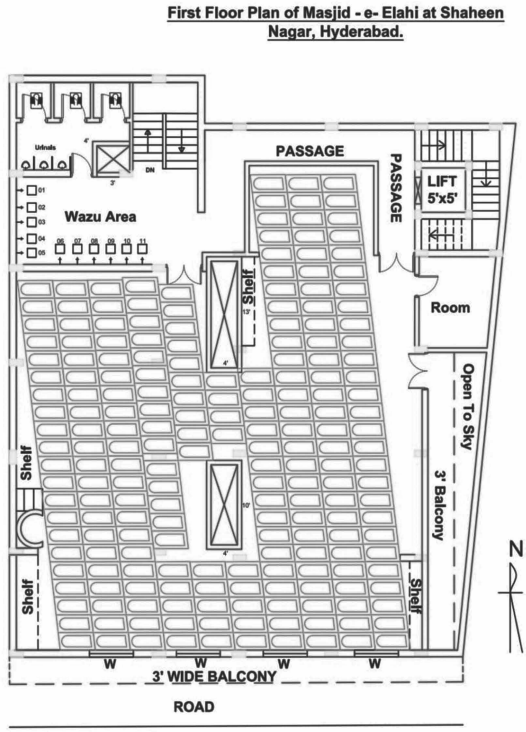

مسجدِ الٰہی زیرانتظام شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ چیرٹیبل ٹرسٹ حیدرآباد کا تعمیری کام شروع ہورہا ہے۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ ایک مخیّرہ خاتون نے 126 گز اراضی ٹرسٹ ہذا کو مسجد کے لئے وقف کردی ہے، اللہ تعالیٰ مخیّرہ کو دونوں جہاں میں بہترین بدلہ دے، آمین۔ مسجدِ الٰہی کی زمین مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم وادیٔ عمر شاہین نگر حیدرآباد کا (اقامتی وغیراقامتی) ادارہ ہے، جو شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیرانتظام 2017 سے خدمات انجام دے رہا ہے، بالکل اسی سے متصل ہے۔ مدرسہ ہذا اور بستی کے لئے مسجد ناگزیر ہے، اس وجہ سے آپ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ مسجد ہذا کی تعمیری کام میں ایک مصلیٰ=/13000 روپئے، ایک اسکوائر فٹ=/830 روپئے نقد یا اشیاء کے ذریعہ معائنہ کرکے حصہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔ جزاک اللہ أحسن الجزاء.

Bank Name : IDBI **A/c Number :** 1327104000065876
A/c Name : SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code : IBKL0001327. Branch: Charminar
G & Phone Pay : 8317692718, WhatsApp: 9392533661

العارض: حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد